اسلامی دُنیا میں
فقہی مذاہب اربعہ کا فروغ
حنفی
شافعی
مالکی
حنبلی
تالیف : علّامہ احمد تیمور پاشا

مع
تاریخ فقہ اسلامی کا تجزیاتی مطالعہ
از
علّامہ ابو زہرہ
مترجم : معراج محمد بارق
قدیمی کتب خانہ ۔ مقابل آرام باغ ۔ کراچی

فقہی مذاہبِ اربعہ کا فروغ

اسلامی دنیا میں

تالیف: علامہ تیمور پاشا

مع

تاریخ فقہِ اسلامی کا تجزیاتی مطالعہ

از: علامہ ابو زہرہ مصری

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

http://toobaa-elibrary.blogspot.com/

اسلامی دنیا میں

فقہی مذاہب اربعہ کا فروغ

حنفی — شافعی — مالکی — حنبلی

تالیف: علامہ احمد تیمور پاشا

مع

تاریخ فقہ اسلامی کا تجزیاتی مطالعہ

از

علامہ ابو زہرہ

مترجم: میراج محمد بارق

قدیمی کتب خانہ - آرام باغ - کراچی ۱

نظرة تاريخية في حدوث

المذاهب الفقهية الأربعة

الحنفي . المالكي . الشافعي . الحنبلي

وانتشارها عند جمهور المسلمين

للعلامة المحقق المغفور له

أحمد تيمور باشا

مع دراسة تحليلية

للأستاذ الشيخ محمد أبو زهرة

١٣٨٩ هـ — ١٩٦٩ م

نشرته

لجنة نشر المؤلفات التيمورية

٢ ميدان البستان — باب اللوق — القاهرة

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
عرضِ مترجم ——— سراج محمد بارق	۷
مقدمہ ——— عبدالسلام شہاب	۱۱
پیش لفظ ——— ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر	۱۵
فقہی مذاہب کی نشوونما منزل بہ منزل۔	۱۷
فقہِ اسلامی کی تدوین، علاقائی لحاظ سے۔	۱۹
تاریخِ فقہِ اسلامی کا تجزیاتی مطالعہ ——— علامہ محمد ابوزہرہ	۲۳
صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا دور	۲۴
تابعین رحمہم اللہ کا دور	۲۸
دورِ تابعین رحمہم اللہ میں فقہی اختلاف کی نوعیت	۲۹
ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کا دور	۳۱
ائمہ اہلِ بیت رحمہم اللہ	۳۲
فقہِ اسلامی دنیا کا عظیم ترین مجموعۂ قوانین	۳۳
اسلامی فقہ کی کتابوں کے یورپی زبانوں میں ترجمے	۳۳

مضمون	صفحہ
فقہِ اسلامی اور جدید مستشرقین	۳۴
ائمہ فقہ کی حیثیت اور ان کے کام کی نوعیت	۳۵
ختم شدہ مذاہبِ فقہ	۳۷
بعض مذاہب کے فنا ہونے کے اسباب	۳۸
آٹھ مذاہب جن کے مسائل وفتاویٰ مدون ہوئے	۳۹
فقہی مذاہب پر اُن کے علاقوں کے رسوم ورواج کا اثر	۳۹
اُن چار مذاہب کا حال جن کی فقہ اب تک موجود ہے:	۴۰
۱۔ مذہب زیدیہ	۴۰
۲۔ مذہب جعفریہ (امامیہ)	۴۱
۳۔ مذہب ظاہریہ	۴۱
۴۔ مذہب اباضیہ	۴۲
ائمہ اربعہ کے سوانح پر کام کی ضرورت	۴۳
علامہ احمد تیمورؒ کی علمی زندگی	۴۵
علامہ تیمورؒ کی وفات	۴۷
علامہ تیمور کا طرزِ نگارش	۴۸
علامہ تیمور کی قدردانی علماء	۴۹
علامہ تیمور کے طرزِ تحریر کی خصوصیات	۵۰
علامہ تیمور کی موجودہ کتاب "مذاہب اربعہ"	۵۲
کتاب کا جائزہ	۵۵
اس کتاب کی تین خصوصیات	۵۸

مضمون	صفحہ

اسلامی دنیا میں فقہی مذاہبِ اربعہ کا فروغ (ایک تاریخی جائزہ)

مضمون	صفحہ
از قلم علامہ احمد تیمور پاشا	۶۳
تمہید	۶۵
مذہبِ حنفی	۶۶
مذہبِ اہل الرائے اور فقہِ حنفی کا آغاز	۶۹
عہدۂ قضاء پر احناف کا تقرر	۷۰
مذہبِ حنفی (شمالی) افریقہ اور سسلی میں	۷۳
مذہبِ حنفی مصر میں	۷۸
مذہبِ حنفی دیگر ممالک میں	۸۲
مذہبِ حنفی اور مذاہبِ متکلمین	۸۵
مذہبِ حنفی کا دائرۂ اثر موجودہ زمانہ میں	۸۵
مذہبِ مالکی	۸۷
مذہبِ مالکی کا آغاز	۸۷
مذہبِ مالکی مصر میں	۸۸
مذہبِ مالکی (شمالی) افریقہ اور اندلس میں	۹۰
مذہبِ مالکی مغربِ اقصیٰ (مراکش) میں	۹۷
مذہبِ مالکی دیگر بلاد میں	۱۰۰

مضمون	صفحہ
مذہبِ مالکی اور مذاہبِ متکلمین	۱۰۰
مذہبِ شافعی	۱۰۱
بانیٔ مذہب	۱۰۱
مذہبِ شافعی مصر و دیگر بلاد میں	۱۰۲
مذہبِ شافعی شام میں	۱۰۷
مذہبِ شافعی ترکستان، ایران اور عراق میں	۱۰۸
مذہبِ شافعی مغرب (شمالی افریقہ) میں	۱۱۴
مذہبِ شافعی اور مذاہبِ متکلمین	۱۱۶
مذہبِ حنبلی	۱۱۷
مذہبِ حنبلی کا آغاز	۱۱۷
مذہبِ حنبلی مصر میں	۱۱۸
مذہبِ حنبلی دیگر ممالک میں	۱۲۰
مذہبِ حنبلی کا بغداد میں زور و غلبہ (۳۲۳ھ میں)۔	۱۲۱
مذہبِ حنبلی کی نشاۃِ ثانیہ بارہویں صدی ہجری میں	۱۲۱
مذہبِ حنبلی اور مذاہبِ متکلمین	۱۲۳
خاتمۂ کلام	۱۲۵
پوری اسلامی دنیا میں مذاہبِ اربعہ کا غلبہ	۱۲۵
مذہبِ ظاہری اور مذہبِ اباضیہ وغیرہ	۱۲۶
فقہی مذاہب کی موجودہ صورتِ حال (ملک وار)	۱۲۷
احناف کی تعداد برِصغیر ہند اور تمام دنیا میں۔	۱۳۱
کتابیات مصادر و مآخذ	۱۳۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مترجم

علامہ احمد تیمور پاشا نے اپنی اس کتاب میں فقہی مذاہبِ اربعہ کی نشوونما اور دنیا میں ان کی ترویج و اشاعت کے موضوع پر ایک منفرد انداز میں قلم اٹھایا ہے۔ جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، یہ ایک تاریخی کتاب ہے۔ اس میں نظریاتی بحثیں نہیں ہیں اور نہ کسی مذہب یا مسلک کے صحیح یا غلط ہونے پر گفتگو کی گئی ہے، بلکہ خالص مؤرخانہ انداز میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جمہور مسلمان جو سُنّی کہلاتے ہیں اور آج چار بھائیوں کی شکل میں ایک قابلِ فخر فقہی سرمایہ کے وارث اور دنیا کے عظیم ترین ذخیرۂ قانون کے مالک ہیں، ان کا یہ علمی و فقہی سفر کس طرح شروع ہوا۔ ابتداء میں کون کون لوگ ان کے ہمسفر تھے۔ ان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا رہی، ان کی باہمی رقابتوں یا محبتوں نے کیا کیا رنگ دکھائے۔ پھر وہ ساتھی کب، کہاں اور کس طرح اس علمی قافلہ سے بچھڑ کر تاریخ کے اوراق میں گم ہو گئے۔ اور پھر ان باقی چار بھائیوں نے کس طرح اپنی باہمی رقابتوں کو ختم کر کے ایک دوسرے کے ساتھ تحمل و برداشت سے رہنا سیکھا۔ پھر وہ کیسی کیسی پُرخطر راہوں سے گزرے، انہوں نے کن کن منزلوں پر ڈیرے ڈالے اور آج کن کن مقامات پر خیمہ زن ہیں۔ یہی گویا فقہی مذاہبِ اربعہ کا تاریخی جائزہ ہے۔

علامہ احمد تیمور پاشا کی یہ مختصر کتاب اسلامی فقہ کے طلبہ و اساتذہ
کے سامنے مذاہبِ فقہ کا تاریخی پس منظر پیش کر کے ان میں نہ صرف
ماضی کا شعور پیدا کرتی ہے بلکہ مستقبل کے فکر کی راہیں بھی ہموار کرتی
ہے۔ جس طرح سیاسی تاریخ کی کتابیں قوموں کے سیاسی عروج و زوال
کے اسباب پر روشنی ڈالتی ہیں، اُسی طرح یہ کتاب بھی فکری تاریخ پیش
کر کے علمی و فکری عروج و زوال کے عوامل و عناصر کی نشان دہی
کرتی ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ
یہ تو اس کتاب کا ایک افادی پہلو ہے۔ اِس کے علاوہ اِس کے
دیگر افادی پہلو اور خصوصیات بھی ہیں۔ اِن مختلف پہلوؤں کو روشن
کرنے اور خود مصنفِ کتاب کی شخصیت کا تعارف کرانے کے لیے
علمی دنیا کی دو عظیم شخصیات نے قلم اٹھایا ہے۔ یعنی شیخ محمد ابو زہرہ
اور ڈاکٹر علی حسن عبد القادر نے اس پر تفصیلی تبصرے لکھے ہیں جو اس
کتاب کے شروع میں شامل ہیں۔ ان میں کتاب کا پورا جائزہ لیا گیا ہے اور
مصنف کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ ان دو تبصروں کے بعد اس
کتاب کے مزید تعارف کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ البتہ کتاب کے
ترجمہ اور حواشی کے سلسلہ میں چند وضاحتوں کی ضرورت ہے۔
یہ ترجمہ اصل کتاب کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن (مطبوعہ ۱۹۶۱ء)
سے کیا گیا ہے۔ مصنف مرحوم نے اس کتاب میں جو تاریخی واقعات
اور دیگر حقائق قلمبند کئے ہیں، دورانِ تحریر وہ کسی وجہ سے ان کے
ماخذوں کے صفحات نمبر اور دیگر تفصیلات ساتھ ساتھ بیان نہیں کر
سکے، بلکہ انہوں نے کتاب کے آخر میں چند صفحات اس مقصد کے

لیے مختص کئے جہاں انہوں نے متعلقہ جملے کے موضوع یا اس کے آخری
الفاظ کا ذکر کر کے اپنے ماخذ کا نام اور صفحہ نمبر لکھ دیا۔ ہم نے
ان کے انہی اشاروں کی مدد سے وہ تمام حوالے اصل کتاب کے ہر
صفحہ پر متعلقہ جگہ نقل کر دیئے ہیں تاکہ قارئین کو مراجعت میں سہولت ہو۔
اس کے علاوہ مصنف نے اپنے ماخذوں کے ایڈیشن (مقام اشاعت
اور تاریخ اشاعت) کی تصریح نہیں کی تھی۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے
ہم نے "کتابیات" کے عنوان سے ان ماخذوں کی پوری تفصیل کتاب
کے آخر میں شامل کر دی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے کوشش کی ہے
کہ ہر کتاب کے اُسی ایڈیشن یا ایڈیشنوں کا ذکر کریں جو مصنف کی حیات
میں شائع ہوئے ہوں اور جن کے بارے میں امکان ہو کہ وہ ان کے
زیرِ مطالعہ رہے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ کسی کتاب کا کوئی
اور ہی ایڈیشن اُن کے پیشِ نظر رہا ہو یا اس کا کوئی مخطوط زیرِ مطالعہ رہا
ہو، کیونکہ ان کی لائبریری میں دنیا کے ہر گوشہ سے کتابیں آ کر جمع ہوئی
تھیں اور مخطوطات کا بھی ایک بیش بہا ذخیرہ اُن کے پاس موجود تھا۔
بہر حال ہماری مرتّبہ اس "کتابیات" کی وجہ سے قارئین کو ان حوالجات
کے نکالنے میں خاصی سہولت ہو جائے گی۔ نیز ان ماخذوں اور ان
کے مصنفین کے مکمل نام بھی سامنے آجائیں گے۔
قارئین کی سہولت کے پیشِ نظر ہم نے کتاب کے حواشی میں بعض
قدیم شہروں اور ملکوں کے محلِ وقوع کی نشان دہی کی ہے، بعض فرقوں
کا تعارف کرایا ہے، اور مصنف کے بعض نکات کی وضاحت کی ہے۔
اس کے علاوہ مناسب جگہوں پر مذاہبِ اربعہ کی تازہ ترین صورتِ حال

کا جائزہ بھی مختصراً پیش کیا ہے تاکہ قارئین سنہ ۱۹۴۳ء اور اس کے بعد موجودہ دور کی صورتِ حال سے بھی کسی حد تک آگاہ ہو سکیں۔

یہ مختصر سی کتاب فقہی مذاہب کی تاریخ کے بعض مخفی گوشے اور ایسے اہم حقائق بیان کرتی ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی دیگر کتابوں میں نہیں ملتے۔ اِس لحاظ سے یہ کتاب تاریخ فقہ کے ایک اہم خلا کو پُر کرتی ہے، اور اِسی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا اُردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ دیگر ممالک کے علمی حلقوں کی طرح ہمارے ملک کے علمی حلقوں میں بھی اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

خادم العلم والعلماء

معراج محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدّمہ

از قلم استاذ عبد السلام شہاب
رکن مجلسِ اشاعتِ تالیفاتِ تیموریہ

چالیس سال سے زائد عرصہ ہوا کہ علامہ مرحوم احمد تیمور پاشا کا یہ نادر علمی مقالہ ایک دینی مجلہ میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانہ میں یہ مقالہ قارئین میں اندازہ سے کہیں زیادہ مقبول ہوا اور علمی حلقوں میں اسے بے حد پسند کیا گیا۔ مختلف ممالک سے قارئین کے بے شمار خطوط وصول ہوئے جن میں اس مقالہ کی تعریف کی گئی تھی۔ ان خطوط لکھنے والوں میں سرِ فہرست اس وقت کے بیسیوں نامور علمائے اسلام، عربی کے بلند پایہ ادیب اور مشہور مفکرین شامل تھے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ جب علمی تحقیق کا یہ قیمتی شاہکار شائع ہوا (جس کی کوئی نظیر اس سے پہلے عربی زبان میں نہیں ملتی) تو اس کی اشاعت کی گونج یورپ اور مغربی ممالک کے علمی حلقوں میں بھی سنی گئی، خصوصاً اعلیٰ پایہ کے مستشرقین نے اس کو نظرِ استحسان دیکھا۔ ان میں سے بہت سے اہلِ علم تو اس مقالہ کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ انہیں تعجب ہے کہ ایسی دقیق علمی تحقیق میں ایک عرب مؤلف ان پر سبقت لے گیا اور اپنی مخصوص علمی کاوش کی بدولت اس موضوع کے مخفی گوشوں کو واضح کرنے اور اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں کامیاب ہوا۔

جب اس علمی مقالہ کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی اور اس کے مصنف کی اتنی قدر و منزلت ہوئی تو اس کو دوبارہ ایک علیحدہ کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا۔ اس کی یہ دوسری اشاعت خود مصنف کی زندگی میں (۱۳۴۴ھ/۱۹۲۶ء میں) عمل میں آئی۔ اس کے بعد یہ کتابچہ پھر دوبارہ مؤلف کی وفات کے تقریباً تین سال بعد ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔

علامہ مرحوم کی متعدد تالیفات میں سے صرف یہی ایک کتابچہ ایسا نہیں جس نے مشرق و مغرب کے بڑے بڑے علماء اور محققین کو متاثر کیا اور قارئین میں مقبول ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم کی تمام تالیفات، خواہ وہ ان کی زندگی میں شائع ہوئیں یا ان کی وفات کے بعد، یا وہ جو عنقریب زیورِ طبع سے آراستہ ہونے والی ہیں، سبھی ان صفات و خصوصیات کی حامل ہیں۔ کیونکہ وہ سب آپ کی علمی گہرائی کی آئینہ دار ہیں، وہ آپ کی ژرف نگاہی اور ٹھوس تحقیق کا نتیجہ ہیں، ان میں بحث کا طریقہ اور سوچ کا انداز صحت مندانہ اور خالص علمی ہے، ان کا جامع اندازِ بیان، ایجاز اور اعلیٰ زباندانی کا نمونہ پیش کرتا ہے جس کو سہلِ ممتنع کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب و طرزِ نگارش میں بڑی لطافت اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔

بے شک علامہ مرحوم کو ان خصوصیات و صفات میں جو فضل و کمال حاصل تھا وہ ان کے چند فطری رجحانات کا مرہونِ منت تھا۔ درحقیقت علامہ مرحوم علم کے پیاسے تھے اور ہمیشہ اپنے علم میں اضافہ کے خواہاں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں نہایت صبر و ضبط اور انہماک سے مطالعہ کا شوق تھا اور اس مطالعہ سے جو معلومات حاصل ہوتی تھیں ان کو حافظہ اور تحریر میں محفوظ رکھنے کا بھی وہ اہتمام کرتے تھے۔ ان کی لائبریری بیش بہا

کتابوں اور مخطوطات کا خزانہ تھی جس میں تقریباً تمام علوم و فنون کی لاتعداد نادر کتابیں بھری پڑی تھیں[1]۔

علامہ مرحوم کو نہ صرف نادر کتابیں جمع کرنے کا شوق تھا بلکہ وہ ان علمی نوادر سے مستفید ہونے کا بھی قوی جذبہ رکھتے تھے، اور پھر دین و علم اور عربی زبان کی خدمت کا ولولہ بھی ان کے سینہ میں موجزن تھا۔

علامہ مرحوم کی ان صفات اور ان کی لائبریری کی وسعت کا اندازہ صرف اس چھوٹے سے کتابچہ سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتابچہ جو اگرچہ حجم میں چھوٹا اور علمی فائدہ کے لحاظ سے بڑا ہے، یہ مؤلف کی بہت بڑی تحقیق اور وسیع مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ اس کے لئے مؤلف نے جن بے شمار علمی کتابوں کو کھنگالا ہے ان میں سے چند مشہور اور نمایاں کتابوں کے نام ہم ذیل میں درج کرتے ہیں، اسی سے آپ ان کی محنت اور ژرف نگاہی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ (ان میں سے اکثر کتابیں کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں)۔

مقدمہ ابن خلدون، خطط المقریزی، نفح الطیب للمقری، الکامل لابن الاثیر، وفیات الاعیان لابن خلکان، صبح الاعشیٰ للقلقشندی، رحلۃ ابن بطوطہ (سفرنامہ ابن بطوطہ)، محاضرۃ الاوائل اور حسن المحاضرۃ للسیوطی، معجم البلدان لیاقوت الحموی، المنهل الصافی لابن تغری بردی، مواسم الادب، بغیۃ الملتمس للضبی، الدیباج المذہب لابن فرحون، نیل الابتہاج، المعجب للمراکشی، الفوائد البہیہ، سرح العیون لابن نباتہ، تہذیب التہذیب و رفع الاصر للحافظ ابن حجر، قضاۃ مصر لعلی بن عبدالقادر الطوخی، تحفۃ الاحباب،

---

[1] اسی مناسبت سے ان کی لائبریری "خزانۂ تیموریہ" کہلاتی تھی (مترجم)

الاعلان بالتوبیخ للسخاوی، ابن قطلوبغا کی بیاض، طبقات الحنفیہ، المرقاۃ الوفیۃ للفیروز آبادی، طبقات المالکیہ، طبقات الشافعیہ و معید النعم للتاج السبکی، احسن التقاسیم للمقدسی، الثغر البسام فی قضاۃ مصر والشام لابن طولون، السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ لمحمد بن حمید المکی، العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین للفاسی، ان کے علاوہ اور بہت سی کتابیں ہیں جن کے نام آپ کو اس کتابچہ کے حواشی میں درج ملیں گے۔[1]

یہی وجہ ہے کہ جب یہ کتابچہ شائع ہوا تو مختلف عرب ممالک اور بلادِ اسلامیہ میں اس کی بے حد مانگ ہوئی اور چند ماہ کے اندر اندر اس کے تمام مطبوعہ نسخے ختم ہو گئے، اور "مجلس اشاعت تالیفات تیموریہ" کے پاس متعدد عرب ممالک اور دیگر مختلف مسلم ممالک سے اس کی فرمائشیں آنے لگیں، بالآخر "مجلس" کو پھر اس کی اشاعت کا اہتمام کرنا پڑا۔

مجلسِ ہذا اس بات پر مسرت اور فخر محسوس کرتی ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اس بیش بہا کتابچہ کا یہ نیا ایڈیشن چھاپنے کی سعادت عطا فرمائی جو استاذ فاضل شیخ محمد ابوزہرہ کی اس موضوع پر ایک تحلیلی بحث (تجزیاتی مطالعہ) اور استاذ ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر کے ایک علمی مقدمہ سے مزین ہے۔

مجلسِ ہذا ان دونوں حضرات کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ وہ ان کو اس عنایتِ خصوصی کی جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی زندگی میں برکت دے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کے پاس محسنوں کے لئے بہترین جزا ہے۔

عبدالسلام شہاب

---

[1] اس کتابچہ میں مذکورہ تمام ماخذوں کی پوری تفصیل ہم نے اس کے آخر میں "کتابیات" کے عنوان سے دے دی ہے۔ (مترجم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از قلم ـ ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر

تقریباً تہائی صدی قبل (۲۰ مئی ۱۹۳۰ء) علامہ و محقق جناب احمد تیمور پاشا مرحوم و مغفور نے قاہرہ میں اپنی لائبریری میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کے انتقال کی وجہ سے علم و تحقیق کی دنیا ایک اعلیٰ پایہ کے عالم اور ماہر محقق سے محروم ہو گئی۔

آپ صحیح معنوں میں ایک محقق تھے، آپ کے وصال پر مشرق و مغرب دونوں طرف کے علماء و فضلاء نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ مستشرقین میں سے بعض فضلاء نے جو آپ سے واقف تھے اس بات کا برملا اعتراف کیا کہ علمی تحقیق میں آپ کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ خود مستشرقین میں ان کے ہمسر بہت کم محقق نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں خاص طور پر علامہ مرحوم کی تصنیف "نظرۃ تاریخیۃ فی حدوث المذاھب الفقہیۃ الاربعۃ وانتشارھا عند جمھور المسلمین" (فقہی مذاہب اربعہ کے ظہور اور ان کے عام مسلمانوں میں فروغ پانے کا تاریخی جائزہ) کا خاص طور سے ذکر کیا کہ "اس جیسا تحقیقی مقالہ کسی یورپی زبان میں بھی نہیں لکھا گیا ہے۔"[1]

اسی لئے میں نے "مجلسِ اشاعتِ تالیفاتِ تیموریہ" کو تجویز پیش کی کہ

---

[1] ڈاکٹر شاخت۔ J. SCHACHT: (Z.D.M.G.) B.g. ۱۵۰

اس بے بہا تحقیقی کتاب کو دوبارہ شائع کیا جائے تاکہ اہلِ علم حضرات اس
سے بآسانی مستفید ہو سکیں، اور اس میں فقہی مذاہب کے تاریخی نشو ونما اور ان
کے جغرافیائی پھیلاؤ کے بارے میں جو بیش بہا معلومات پیش کی گئی ہیں ان سے
بہرہ ور ہو سکیں۔

درحقیقت اس مقالہ میں جو معلومات اور حقائق پیش کئے گئے ہیں وہ
متنوع قسم کے معتبر ماخذوں سے جمع کئے گئے ہیں اور یہ حقائق مختلف قسم کی
علمی کتابوں میں اس قدر بکھرے ہوئے ہیں کہ ان کا سراغ لگا کر ان کو اکٹھا
کرنا ہر عالم کے بس کی بات نہیں ہے۔

میری رائے میں جو کچھ مواد اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے اس پر مزید
تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے، اور اس بحث و تحقیق کو آگے بڑھانے
اور اس کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کا کافی کام باقی ہے۔ مثلاً اُن
اسباب و عوامل پر تحقیق کی جائے جن کی بدولت ان چار فقہی مذاہب کو دیگر
فقہی مذاہب کے مقابلہ میں اسلامی ممالک میں فروغ پانے کا زیادہ موقع ملا۔

میرے خیال میں اس سے بڑھ کر ایک اور کام کرنے کی زیادہ ضرورت
ہے۔ وہ یہ کہ اس امر کی تحقیق کی جائے کہ یہ فقہی مذاہب جن جن ممالک میں غالب
ہو کر رائج ہوئے تو ان فقہی مذاہب پر ان مختلف ممالک کے ماحول، وہاں
کے رسوم و رواج اور وہاں کے باشندوں کے عادات و اطوار کے کیا اثرات
مرتب ہوئے، یعنی ان ملکوں میں کون سے نئے مسائل پیدا ہوتے، ان کے
کیا حل پیش کئے گئے، وہاں کے علماء اور مفتیانِ کرام نے کیا کیا تفریعات
کیں، نیز مسائل کی ترجیح اور تقلید میں ان کا کیا طرزِ عمل تھا۔ مختصراً یہ کہ تحقیقی
انداز میں یہ دیکھا جائے کہ ان ممالک کے علماء، مصنفین اور مفتیین نے اپنے

اپنے علاقہ کے حالات کی روشنی میں اور اپنی متنوع ضروریات اور مختلف ماحول میں
جب کسی مذہب کے اصول و فروعات کو عملی زندگی میں نافذ کیا اور اس مقصد کے
لئے فقہی کتب اور فتاویٰ مرتب کئے تو دو مختلف ملکوں میں پائے جانے والے
ایک ہی مذہب کے پیروؤں کے طرزِ عمل اور رجحانات میں کیا فرق واقع ہوا۔

فقہی مذاہب کی نشو ونما منزل بہ منزل

یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ ہر مسلک و مذہب کی فقہ اکثر اوقات
ان نظریاتی حدود و قیود سے آزاد ہوتی رہی جو اس کے ابتدائی دور کے فقہاء
نے اس پر عائد کی تھیں، اور جس ملک یا علاقہ میں وہ رائج اور مقبول ہوئی وہاں
کے حالات و عادات سے متاثر ہو کر اس نے اپنی ہیئت بدل ڈالی اور وہ
راہیں اختیار کیں جو اس علاقہ کے ماحول سے مطابقت رکھتی تھیں۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ ان پر اپنے اپنے مخصوص ملک اور علاقہ کی چھاپ لگ گئی۔ دراصل یہ
قدرت کے اس قانون کا کرشمہ ہے جو اس دنیا کے ہر ذی روح وجود میں جاری
ہے کہ وہ لازماً اپنے زمان و مکان کے عوامل کا تابع رہتا ہے اور ان کے
اثرات سے بچ نہیں سکتا۔

اس کی سب سے واضح مثال مذہبِ شافعی میں قدیم و جدید دو قسم کے
مسائل کی موجودگی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ قدیم سے مراد امام شافعیؒ کا وہ قول ہے
جو انہوں نے اپنے قیامِ عراق کے دوران بیان کیا، خواہ وہ فتویٰ کی
شکل میں تھا یا تصنیف کی صورت میں۔ اور جدید وہ قول ہے جو امام شافعیؒ
نے اپنے قیامِ مصر کے دوران بیان کیا۔ درحقیقت عراق کے دورانِ قیام
ان کے ذہن میں جو بہت سے اشکالات تھے وہ مصر آکر واضح ہوئے اور ایسے

فقہی دلائل ان کے سامنے آئے جو اس سے پہلے ان کے علم میں نہیں آئے تھے۔ علاوہ ازیں یہاں آکر ان کو ایسی احادیث بھی ملیں جو عراق میں اپنا قدیم مذہب تدوین کرتے وقت ان کو نہیں پہنچی تھیں۔

نیز اس مذہب (شافعی) میں دو مزید طریقے بھی رائج ہیں۔ پہلا طریقہ عراقیوں کا ہے اور دوسرا طریقہ خراسانیوں کا۔ پہلے طریقہ کا یہ امتیاز بیان کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ کامل اور پختہ و ثابت ہے۔ جبکہ دوسرے کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تحقیق و تطبیق اور تفریع و ترتیب میں بہتر ہے۔

ایسی ہی بات مالکی مذہب کے بارے میں بھی بیان کی جاتی ہے کہ ان کے ہاں بھی کئی طریقے رائج ہیں۔ ایک عراقیوں کا طریقہ ہے اور دوسرا اہلِ مغرب (شمالی افریقہ) کا۔ تیسرا طریقہ اندلس میں اہلِ قرطبہ کا ہے اور چوتھا اہلِ مصر کا ہے جس میں دیگر علاقوں کے طریقوں کی آمیزش ہے۔ ان میں سے ہر طریقہ کی الگ الگ تصانیف ہیں، اور وہ سب مالکی مذہب میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

عراق کے مالکیوں کا طریقہ تو اس لحاظ سے احناف کے زیادہ مشابہ ہے کہ اس میں رائے کا اجماع کرنے اور استدلال قائم کرنے کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ دوسری جانب اہلِ مغرب (شمالی افریقہ) کے طریقہ میں یہ بات غالب ہے کہ وہ مسئلہ کے عملی پہلوؤں کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور روزمرہ کے مسائل اور خصومات (نوازل) میں تطبیقِ احکام کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں جدید دور کی ایک اور مثال دیکھئے آج کل مصر اور جزیرہ نمائے عرب میں رائج فقہِ شافعی، ملایا (ملائیشیا) اور انڈونیشیا میں رائج فقہِ شافعی سے قطعی مختلف ہے۔ وجہ یہی ہے کہ ان دونوں علاقوں میں پائے جانے

والے مختلف ماحول اور عادات و رسوم نے ایک ہی مذہب کی ظاہری شکل تبدیل کر دی ہے۔

ایک ہی مذہب میں علاقہ کے لحاظ سے پائے جانے والے جس اختلاف کو ہم نے فقہ مالکی اور فقہ شافعی کی مثالیں دے کر واضح کیا ہے، یہ صرف ایک یا دو مذاہب تک محدود نہیں ہے، بلکہ دیگر فقہی مذاہب میں بھی ایسے ہی علاقائی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اور ایک ہی مذہب کے یہی علاقائی اختلافات ہیں جنہوں نے جدید فقہ کو مفروضہ جامد وحدت نہیں بننے دیا، بلکہ اس میں رائے اور فکر کی مختلف راہیں پیدا کیں جو متعدد اسلامی معاشروں کی عملی ضروریات سے وابستہ تھیں۔ انہی کی وجہ سے ان مختلف معاشروں کے فقہی مذاہب میں مابہ الامتیاز خصوصیات پیدا ہوئیں اور ان کا ایک پختہ مزاج وجود میں آیا۔ پھر اسی اختلافِ رائے اور اختلافِ فکر کی بازگشت مختلف اسلامی ممالک کے فقہاء میں پائی گئی جنہوں نے فقہ اسلامی کے ذخیرہ پر نئے سرے سے غور و فکر کرنے اور اس کو باقاعدہ مدوّن کرنے کی دعوت دی۔

فقہ اسلامی کی تدوین، علاقائی لحاظ سے

میری رائے میں فقہ اسلامی کے علاقہ وار مطالعہ کی صحیح شکل اس وقت سامنے آئے گی جبکہ مختلف فقہی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور ان میں مندرج احکام و آراء میں ترجیح و اختیار کا عمل شروع کیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ طریقہ اختیار کرنا درست نہیں ہوگا کہ کوئی فقیہ ان کتابوں کے سب احکام کو ایک ہی سطح پر رکھتے ہوئے محض نظریاتی طور پر ان میں سے

بعض احکام و قوانین کو چن لے اور ان کو باہم ملا کر ایک نئی فقہ یا نیا مسلک بنالے؛ اس طرح وہ حقیقتاً اپنے زمانہ اور علاقہ کی ضروریات اور ان کے تقاضوں سے بہت دور چلا جائے گا، اجتہادی لحاظ سے بھی اور عملی و تطبیقی لحاظ سے بھی۔

ہمارے خیال میں سب سے زیادہ مناسب قابلِ اعتماد اور قابلِ قبول تجویز اس سلسلہ میں یہی ہو سکتی ہے کہ فقہ اسلامی کو متفرق علاقوں کے لحاظ سے مدوّن کیا جائے جس میں ہر علاقہ کو ایک جغرافیائی وحدت اور معاشرتی اکائی کی حیثیت سے لیا جائے، اور ان مختلف مسلم علاقوں یا منطقوں کی فقہ اس بنیاد پر مدوّن کی جائے کہ ان میں سے ہر علاقہ اور منطقہ کے معاشرتی اور ثقافتی نظام کی کچھ جداگانہ خصوصیات ہیں جو ان میں رائج مختلف رسوم و رواج، ان کے جداگانہ نظامِ سیاست، منفرد قومی نفسیات اور طرزِ معاشرت و نظامِ معیشت کا نتیجہ ہیں اور ان کے مخصوص جغرافیائی حالات اور طبعی ماحول کی مرہونِ منت ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف علامہ ابن خلدون نے بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ اپنی مایۂ ناز تصنیف "مقدمہ" میں مالکی مذہب کے شمالی افریقہ اور اندلس میں فروغ پانے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

"اہلِ مغرب (شمالی افریقہ) اور اندلس کے باشندوں پر بدوی طرزِ زندگی غالب تھا، اور اہلِ عراق جیسی شہری زندگی اور تہذیب و تمدن سے وہ کوسوں دور تھے۔ لہٰذا اپنے اسی بدوی طرزِ معاشرت کی وجہ سے وہ اہلِ حجاز کی طرف زیادہ مائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مالکی مذہب میں دیگر مذاہب کی طرح تمدنی زندگی کی باریکیاں اور موشگافیاں نہیں تھیں (بلکہ یہ سیدھا سادہ مذہب تھا)"[1]

[1] مقدمہ ابن خلدون طبع قاہرہ سنہ ۱۹۰۰ء ص ۴۴۹۔

ہماری مذکورہ بالا گفتگو سے یہ صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تمام معاشرتی عوامل ایک ایسی وحدت پیش کرتے ہیں جس کا عکس ہمیں ان کے سرمایۂ فقہ، نظامِ قضا (عدلیہ) اور ان کے فقہاء کے فتووں اور قضاۃ کے فیصلوں میں نظر آتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو لوگوں کی مصلحتِ عامہ کی خاطر نہ صرف کتبِ فقہ کے مطالعہ کے دوران ملحوظ رکھنی چاہیے بلکہ قانون سازی کے وقت ان کتابوں سے قوانین اخذ کرنے اور ان میں باہم ترجیح دینے کے عمل میں بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے۔

الغرض جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک متقدمین فقہاء میں کسی نے فقہِ اسلامی کے علاقہ وار مطالعہ اور اس کی علاقہ وار تدوین پر توجہ نہیں دی ہے حالانکہ اس موضوع پر غور و فکر اور کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ علامہ مرحوم احمد تیمور (پاشا) کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے جن کی تالیف نے مجھے اس تجویز کے پیش کرنے کا موقع فراہم کیا۔

مجھے امید ہے کہ ان کے اس وقیع کتابچے کے مختصر پیش لفظ میں میں اپنی تجویز اور اس جدید نظریہ کا خاکہ پیش کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق عطا کرنے والا ہے۔

علی حسن عبد القادر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ فقہِ اسلامی کا تجزیاتی مطالعہ

از قلم: علامہ محمد ابو زہرہ

(استاذ الشریعہ، جامع ازہر)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی نبیہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و علی آلہ وصحبہ اجمعین۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی امین بنا کر بھیجا۔ اور آپ نے اپنے رب کا پیغام (لوگوں کو) پہنچایا، شریعت الہٰی کی پوری وضاحت فرمائی، حتیٰ کہ آپ اپنے بعد لوگوں کو ایسی واضح راہ پر لگا کر رخصت ہوئے جس کی رات، دن کی طرح روشن ہے۔ اس راہ پر چلنے والا کبھی نہیں بھٹکتا۔ حق اپنے طالب سے کبھی مخفی نہیں رہتا، چاہے اس کے پاس کوئی چراغ نہ ہو سوائے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، ہاں البتہ اُسے عقلِ سلیم اور فہمِ مستقیم دی گئی ہو، اور اس کے سینہ میں نورِ اخلاص سے روشن دل ہو، کیونکہ وہ ان کی درست رہنمائی کی روشنی میں اس راہِ مستقیم پر چل کر شریعت کے اصل مصادر اور ماخذ کو سمجھنے کی قابلیت حاصل کرے گا۔ اس راہ میں نہ کوئی کجی ہے اور نہ کوئی رکاوٹ۔ اس راہ پر چلنے والے کو اسلامی شریعت کے اصل مقاصد و مطالب کی فہم عطا ہو گی، مرتب و منظم نتائج اس کے سامنے آئیں گے۔ اس کے علاوہ وہ اسلامی تعلیم کے حقائق

کو ایک مرتب و منظّم علمی لڑی میں باہم ایسا مربوط کر سکے گا جیسے ایک ہار میں
موتی ہوتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوتے۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے رفیق اعلیٰ کی طرف انتقال سے
قبل وجودِ انسانی کو اسلامی تعلیم اور اس کے حقائق سے روشن کر دیا تھا، عقیدہ
کے لحاظ سے بھی اور اخلاق و آداب اور قوانین کے لحاظ سے بھی (یعنی شریعت
کے تینوں شعبوں کی تعلیم ان کو دے دی تھی) پھر یہ اسلامی تعلیمات آپؐ
کے بعد آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے ہمیں پہنچائیں۔ وہ درحقیقت روشن ستاروں
کی طرح تھے، جو (مختلف مقامات پر) چمک کر اپنی روشنی پھیلا رہے تھے تاکہ
ہماری عقلیں روشن ہو کر صحیح راہ پائیں اور علمِ رسالت سے پوری طرح مستفید ہوں۔
آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے بارے میں یہی فرمایا ہے کہ:-

أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ — میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں، ان میں
اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ — سے تم جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے

یہ اصحابؓ علمِ رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے حامل تھے جس کو انہوں نے
اپنے بعد والی نسلوں کو منتقل کیا اور اس طرح دراصل انہوں نے رسول اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم کے حکم کی بجا آوری کی، کیونکہ آپؐ نے ہمیشہ اپنا کلام دوسروں
تک پہنچانے کا حکم دیا اور فرمایا:-

نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي — اللہ تعالیٰ اس شخص کا چہرہ تر و تازہ رکھے جس نے میری
فَوَعَاهَا كَمَا سَمِعَهَا فَرُبَّ — بات سُنی اور جیسی سُنی تھی ویسی ہی (حافظہ میں) محفوظ
حَامِلِ فِقْهٍ لَا فِقْهَ لَهُ وَرُبَّ — رکھی (اور آگے دوسروں کو پہنچا دی)، کیونکہ بہت سے
حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ — سننے والے (اس سُنی ہوئی بات میں موجود) حکمتوں

أَفْقَهُ مِنْهُ" او کما قال صلی اللہ — کو سمجھ نہیں سکتے، اور بہت سے سننے والے اس بات
علیہ وسلم (مشکوٰۃ، کتاب العلم) — کو اپنے سے زیادہ سمجھدار لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں"۔

درحقیقت یہی عالی مرتبہ اصحابِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تھے جنہوں نے
وحی کے مواقعِ نزول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ ان موقعوں پر خود موجود تھے۔
انہوں نے نبوت کے علوم و معارف کا علم خود اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں
سے دیکھ سُن کر حاصل کیا تھا۔ ان کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس
امانت کو عہدِ رسالت کی خوشبو سے معطّر اور نورِ نبوت کی ضیا پاشیوں سے
روشن صورت میں، اُس کے اصل جلال و جمال کے ساتھ اپنے بعد آنے والی
نسلوں کو منتقل کر دیں۔ بالآخر یہی ہوا کہ عہدِ صحابہؓ ختم نہیں ہونے پایا تھا
کہ انہوں نے کلامِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بلا کم و کاست پورا کا پورا اگلی
نسل کو منتقل کر دیا۔ اگر کوئی حدیث بعض صحابہؓ کو معلوم نہیں ہوتی تھی تو اس کا
علم دوسرے صحابہؓ کو ہوتا تھا۔ امام شافعیؒ نے درست فرمایا ہے کہ "سب
صحابہؓ نے (مل کر) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات و واقعات
اور آپ کے تمام اقوال و فتاویٰ بیان کر دیئے ہیں"۔

اس لحاظ سے اگر ہم دیکھیں تو عہدِ رسالت اگر شریعت کی تبلیغ کا دور
ہے تو عہدِ صحابہؓ اس کو (حافظہ میں) محفوظ رکھنے اور اپنے بعد آنے والوں کو
اسی اصل حالت میں منتقل کرنے کا زمانہ ہے جیسے وہ عہدِ نبوت میں بیان
کی گئی تھی۔

(واضح رہے کہ صحابہ کرامؓ کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ وہ احادیث و اقوالِ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بعینہٖ دوسروں تک پہنچا دیں، بلکہ ان کا منصب
یہ بھی تھا کہ اگر کسی مسئلہ میں ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم نہ ملے

تو وہ استنباط و اجتہاد سے کام لے کر اپنی رائے قائم کریں۔ اس سلسلہ میں
خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہدایت فرمائی اور اجتہاد کرنے کی ترغیب
دی، اور اس کو کارِ ثواب قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

المجتہد اذا اصاب اجران — "مجتہد جب درست اجتہاد کرے تو اس کے لئے
واذا اخطأ اجر واحد — دو اجر ہیں، اور اگر وہ غلطی کرے تو ایک اجر ہے۔"

گویا دونوں حالتوں میں اسے اجر ملتا ہے۔

اسی لئے علماء نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ جو شخص اجتہاد کرنے کی صلاحیت
رکھتا ہو اس پر اجتہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔ معتبر راویوں سے حدیث مروی ہے
کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا قاضی
بنا کر بھیجا تو ان سے فرمایا:

"تم (لوگوں میں) کس (قانون) سے فیصلہ کرو گے؟"

حضرت معاذؓ نے جواب دیا: "میں کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔"

آپؐ نے پوچھا: اگر اس میں تمہیں کسی مسئلہ یا قضیہ کا حکم نہ ملے تو
پھر کیا کرو گے؟

انہوں نے جواب دیا: پھر میں سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
سے فیصلہ کروں گا۔

آپؐ نے پوچھا: اگر اس میں بھی حکم نہ ملے تو پھر؟

انہوں نے جواب دیا: پھر میں خود کوشش (اجتہاد) کروں گا اور
اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔

ان کا یہ جواب سن کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر فرمایا:
"اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے رسول اللہ کے نمائندہ کو وہ بات
سجھائی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے۔"

واضح رہے کہ صحابہ کرامؓ کا اجتہاد (عام اجتہاد کی طرح نہیں تھا بلکہ یہ)
نورِ نبوت ہی کا ایک حصہ تھا کیونکہ وہ شریعت کے اغراض و مقاصد دیگر
لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔ لہٰذا ان کی رائے عام رائے نہیں تھی۔ بلکہ وہ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور پیروی تھی۔ یہی بات حضرت امام مالکؒ
نے فرمائی ہے، ان کا قول ہے:

"صحابہ کرامؓ کے اجتہاد و فتاویٰ رائے تو ہیں مگر وہ (عام) رائے
(کی طرح) نہیں ہیں۔"

یہ اس لئے کہ ان کے اقوال حقائقِ شریعت پر کسی طرح کا تجاوز یا
ان سے انحراف نہیں ہیں بلکہ انہوں نے سرچشمۂ نبوت و شریعت سے جو
کچھ سیکھا تھا اور جو اقوال لسانِ نبوت سے سنے تھے، اور آپؐ کے جو
اعمال و افعال اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، تو اسی براہِ راست حاصل کئے
ہوئے علم سے ان صحابہ کرامؓ کے فتاویٰ و اجتہادات مقید تھے۔

امام ابن قیم جوزیہؒ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"صحابہ کرامؓ کی آراء میں سے بہت سی رائیں دراصل سنتِ (نبویہ) ہیں،
کیونکہ ان میں سے بہت سے صحابہؓ فتویٰ دیتے وقت اس قول کو نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کی بجائے خود اپنی طرف منسوب کرنے کو ترجیح
دیتے تھے۔ ان کو اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں ان کو اشتباہ نہ ہو گیا ہو (اور اس
اشتباہ کے نتیجہ میں کہیں وہ اپنی رائے کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کی طرف منسوب نہ کر دیں) اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس وعید
کے سزاوار بن جائیں کہ "جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا

ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔"

جمہور مسلمین نے صحابہ کرامؓ کے اقوال و فتاویٰ کو سنتِ رسولؐ سے ملحق کیا ہے۔ اور یہ صحیح بھی ہے، کیونکہ ان کے اقوال میں یا تو کسی سنتِ نبوی کا بیان ہوتا ہے، یا وہ اقوال آپ کی کسی وحی سے مستنبط ہوتے ہیں، اور ہر حال میں اسی سرچشمہ سے جاری ایک چشمہ اور اسی نور سے نکلا ہوا ایک نور ہوتے ہیں۔

الغرض اس طرح صحابہ کرامؓ نے فقہِ نبوی کا ایک وافر ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا۔ یہ ذخیرۂ فقہ یا تو صاف طور پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے منصوص تھا یا آپ کے اقوال و افعال سے مستخرج و مستنبط تھا یا جن مقاصدِ اسلام اور اغراضِ شریعت کا ان کو علم تھا اس پر منطبق تھا۔ ان کے بعد اس علم اور ذخیرۂ فقہ کو ان کے تلامذہ تابعینؒ نے اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔

اس زمانہ میں صورتِ حال یہ تھی کہ ہر صحابیؓ کے ساتھ چند تابعی ہوتے تھے جو ہمیشہ یا اکثر ان کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ ان میں سے بعض تابعی تو کسی ایک مخصوص صحابی کی صحبت و شاگردی کو اپنا شعار بنا لیتے یا زیادہ تر ان کی صحبت میں رہتے (اور ان کے مخصوص شاگرد کہلاتے)۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا علم اُن کے مولیٰ حضرت عکرمہؒ نے روایت کیا اور ان کا علمِ تفسیر حضرت مجاہدؒ نے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کا علم نقل کرنے والے حضرت سعید بن المسیبؒ اور ان کے چند دوسرے ہمعصر تابعی تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا علم محفوظ کرنے والے ان کے مولیٰ نافعؒ تھے۔ ادھر عراق میں جو صحابہ کرامؓ تشریف لے گئے تو وہاں حضرت عبداللہ

بن مسعودؓ کا علم ہم تک پہنچانے والے حضرت علقمہؒ اور ابراہیم نخعیؒ تھے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا علم (اگلی نسلوں کو) منتقل کرنے والے آلِ بیت وغیرہم تھے۔ اس کے علاوہ ان کی بعض آراء و فتاویٰ جو حقائق کا نچوڑ تھے ان کا علم بعض صحابہ کرامؓ کو تھا۔ ان کی بعض رائیں اور فیصلے اُلجھے ہوئے قضیوں اور بعض پیچیدہ مسئلوں کو سلجھا کر عیاں کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کو بھی جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہوتا تو فرماتے: "یہ (مشکل) مسئلہ درپیش ہے اور اس کو حل کرنے کے لئے ابوحسن (علیؓ) موجود نہیں ہیں۔"

یہ سب تابعینؒ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ اور آپ کے افعال و تقریرات کے بارے میں مروی تمام آثار کو نقل کرتے رہے اور لوگوں سے بیان کرتے رہے۔ اس کے علاوہ صحابہ کرامؓ کا علم بھی نقل کرتے رہے، جس پر یہ مزید تخریج کرتے تھے، اور یہ تابعین حضرات صحابہ کرامؓ کے اجماع اور ان کے متفق علیہ فتاویٰ کو حجتِ قطعیہ سمجھتے تھے اور اس کے اتباع کو لازمی قرار دیتے تھے۔ اگر ان میں اختلاف تھا تو صرف اس بات پر کہ اُن کے اقوال و فتاویٰ میں سے قابلِ ترجیح کون سا قول ہے۔ ورنہ وہ ان کے مجموعی اقوال و فتاویٰ سے باہر نہیں نکلتے تھے، بلکہ اسی دائرہ میں رہتے ہوئے ترجیح اور تخریج کا عمل جاری رکھتے تھے۔
بیشتر صورتِ حال یہ تھی کہ ہر شاگرد و تابعی صحابہؓ میں سے اپنے ہی شیخ کا اتباع کرتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ تابعین اُن امور میں اجتہاد سے بھی کام لیتے تھے جن کی بابت انہیں کسی صحابیؓ کی رائے کا علم نہیں ہوتا تھا۔ ایسے معاملات میں وہ اجتہاد کر کے اپنی رائے قائم کرتے تھے جیسا کہ ان کے شیوخ صحابہؓ

کا طریقِ کار تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ تابعین میں اجتہاد کے مختلف طریقِ کار اختیار کیے گئے جو بعض پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مختلف تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی شریعت کے حلقہ اور سنّت کے دائرہ سے باہر نہیں نکلا اور نہ منحرف ہوا۔ وہ سب کے سب کتاب و سنّت اور علمِ صحابہؓ سے وابستہ رہے اور اسی وابستگی کو وہ گمراہی و ضلالت سے بچاؤ کا ایک ذریعہ سمجھتے رہے۔

ان کے اجتہاد کے طریقِ کار میں جو فرق پایا جاتا تھا اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً عراق کے فقہاء جب نصوصِ کتاب و سنت اور اقوالِ صحابہؓ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ پاتے تو اجتہاد کرتے وقت زیادہ تر قیاس سے کام لیتے۔

اِس کے برعکس فقہائے حجاز کا طریقِ کار دوسرا تھا۔ وہ اجتہاد کرتے وقت مصالحِ مرسلہ کو زیادہ تر پیشِ نظر رکھتے۔ ان میں سے ہر طریقِ اجتہاد کا ایک الگ مدرسہ اور مرکز قائم ہو گیا۔ اِن مدارس نے سب سے پہلے عہدِ تابعینؒ میں جڑیں پکڑیں، پھر یہ روز بروز پھلنے پھولنے لگے اور بالآخر تکمیل کے سب مراحل طے کر کے اپنی اپنی جگہ پختہ ہو گئے۔

(یہاں ہم یہ بتاتے چلیں کہ بے شک صحابۂ کرامؓ میں فقہی اختلاف موجود تھا، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اور اسی طرح تابعین حضرات میں بھی یہ اختلاف پایا جاتا تھا جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں۔ درحقیقت فقہی مسائل میں فروعی اختلاف ہونے سے نہ مسلمانوں کو کوئی نقصان ہے اور نہ اسلامی حقائق و شریعت کو، بشرطیکہ ہر ایک کا مقصد حق بات تک پہنچنا ہو، اور کسی اختلافی رائے سے کوئی نص کالعدم نہ ہوتی ہو۔ اور نہ کسی اصولِ اسلام پر زد

پڑتی ہو، اور نہ مقاصدِ شریعت میں سے کوئی مقصد فوت ہوتا ہو۔

اِس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے فرمایا: "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرامؓ میں باہم جو فقہی اختلاف پایا جاتا ہے اُس سے مجھے اِس قدر خوشی ہوتی ہے کہ قیمتی سُرخ اونٹوں کے حاصل ہونے پر بھی نہ ہو۔ سوچو اگر سب صحابۂ کرامؓ ہر مسئلہ میں صرف ایک ہی رائے پر متفق ہوتے تو لوگوں کو ہر معاملہ میں کس قدر تنگی پیش آتی۔")

اِن تابعینِ کرامؒ کے بعد طبقۂ اولیٰ کے ائمہ مجتہدین آئے مثلاً ربیعہ رائیؒ، امام مالک بن انسؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام اوزاعیؒ، امام سفیان ثوریؒ، امام لیث بن سعدؒ، اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے مجتہدینِ کرام۔

یہ سب مجتہدین تابعینؒ سے ملے، ان سے علم حاصل کیا، ان سے آثار و احادیث سُنیں اور استنباط کے طریقے سیکھے۔ چنانچہ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے (کوفہ میں) ابراہیم نخعیؒ اور عطاءؒ اور حماد بن ابی سلیمانؒ وغیرہ سے علمِ فقہ حاصل کیا۔ اور امام مالکؒ نے (مدینہ میں) نافعؒ، محمد ابن شہاب زہریؒ اور قاسم بن محمدؒ اور ان جیسے دیگر تابعین سے علم حاصل کیا جو فقہ میں مشہور تھے اور ان میں سے بعض فقہائے سبعہ کہلاتے تھے، مثلاً حضرت عروہ بن زبیرؒ اور سلیمان بن یسارؒ وغیرہ۔

ان ائمہ کی بدولت پھر تو فقہ کا چشمہ جاری ہو گیا، تلامذہ کی کثرت ہوئی اور فقہ کا درس لینے والے روز بروز بڑھتے گئے۔ فقہ کے ممتاز علماء کی خوب قدر دانی ہونے لگی، دُور دُور سے لوگ سواریوں پر آتے اور ان سے استفادہ اور مذاکرہ کرتے، اسی طرح ان کے فتوے بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ (منتقل)

ہوتے ہوئے دور دراز شہروں تک پہنچنے لگے۔

اس زمانہ میں ایامِ حج ایک طرح سے علماء کی باہمی ملاقات کے دن بن گئے تھے۔ اس مبارک موقع پر فقہاء ایک دوسرے سے علمی مذاکرے کرتے تھے، بلکہ بعض فقہاء تو ان دنوں حج کی نیت ہی اس غرض سے کرتے تھے کہ عبادت اور قربت الی اللہ کے ساتھ ساتھ وہ اکتسابِ علم بھی کریں گے، اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ علم کو بھی زادِ سفر بنائیں گے کہ علم بھی درحقیقت تقویٰ کا ایک حصہ ہے جبکہ اس کے حاصل کرنے کا مقصد اللہ تعالےٰ کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہ ہو۔ کیونکہ احادیثِ نبوی سے ثابت ہے کہ اہلِ علم کو فرشتے گھیرے رہتے ہیں۔

مزید برآں ان حضرات کے پڑوس میں، اسلامی معاشرہ کے دوسری جانب اہلِ بیت حضرات تھے جو حضرت علیؓ اور ان کے صاحبزادگان سے مروی احادیث اور ان کی فقہ کو جمع کر رہے تھے۔ ان میں بعض مشہور ائمہ تھے جنہوں نے (اپنی) فقہ کی بنیادیں ڈالنے اور ان کو مضبوط کرنے میں پورا حصہ لیا۔ ان ائمہ میں چند نمایاں نام یہ ہیں، حضرت زید بن علی زین العابدینؒ، ان کے بھائی محمد باقرؒ، ان کے بھتیجے امام جعفر صادقؒ۔ انہی میں سے امام عبداللہ بن حسنؒ بھی تھے جو حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شیخ و استاد تھے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور حضرت امام مالکؒ کے نزدیک آلِ بیت کا ایک نمایاں مقام تھا۔

الغرض ائمہ فقہاء کے اجتہاد و اخلاص اور نیک نیتی کے نتیجہ میں فقہ کا ایک ایسا مجموعہ وجود میں آیا جو اسلامی قوانین کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا۔ اس طرح انسانی معاملات کو اسلامی طریقہ سے طے کرنے کے قواعد و قوانین کا ایسا عظیم مجموعہ مدوّن ہو گیا جو اس سے پہلے (انسانی تاریخ میں) کبھی نہیں جمع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں نہ صرف انسانی افراد کے باہمی معاملات بلکہ مختلف انسانی گروہوں اور ریاستوں کے مابین معاملات کو درست طریقہ پر فیصل کرنے کے قواعد بھی مندرج تھے۔

ان کے بعد آنے والی نسلوں نے اُن کی اس محنت کے پھل کی قدر کی اور پھر نسل در نسل اپنے تلامذہ کو یہ علمی اثاثہ منتقل کرتے رہے۔ انہوں نے اس کی تدریس اور اس پر مزید تخریج و تفریع کا سلسلہ جاری رکھا، اس طرح انہوں نے جو کچھ ورثہ میں پایا تھا اس میں علم کی جڑیں قائم کیں جو رفتہ رفتہ بڑھ کر تناور درختوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ یہ تناور درخت اِس قدر عظیم تھے کہ جو بھی ان کے سایہ سے مستفید ہونا چاہے وہ اس کو سایہ فراہم کرنے کے قابل تھے۔ ان فقہائے کرام نے جو بھی اجتہاد کیا اور تخریجات کیں ان میں وہ کتاب و سنّت کی حدود سے باہر نہیں نکلے اور نہ ان کے طریقہ کی خلاف ورزی کی، بلکہ پابندی سے مومنین کے راستہ پر گامزن رہے۔

درحقیقت فقہ کا یہ عظیم مجموعہ زمین پر نور کی روشن شاہراہ ثابت ہوا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ نے اپنے علمی احیاء (RENAISSANCE) کے دور میں ان مسلم فقہاء کی قانونی آراء کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا، چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ مالکی مذہب نے اندلس کو پار کر کے وسط فرانس بلکہ اس

سے بھی آگے تک اپنا راستہ بنایا۔[1] وسطی یورپ میں اسلامی فقہ کی کتابوں کے ترجمے ہوئے، بلکہ انگلستان میں بھی مسلمانوں کے اس علمی ذخیرہ کو انگریزی زبان میں منتقل کیا گیا۔

اب ہم (مغربی دنیا کے) اُن لوگوں کو دعوت دیتے ہیں جو اپنے آپ کو مستشرقین کہلاتے ہیں، اُن میں سے اکثر صرف ماہر لسانیات ہیں، فقہاء نہیں ہیں، لیکن پھر بھی ان میں سے اکثر بغیر کسی دلیل اور علمی سند کے اسلامی فقہ سے تعرض کرتے ہیں۔ ان کے دل میں اسلام کے لئے کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ وہ محض اوہام و شکوک کے پیچھے لگ کر انہی کی مدد سے "حقائق" ترتیب دیتے ہیں، الفاظ کو ان کی اصل جگہ سے ہٹا کر عبارتوں کے غلط معنی بیان کرتے ہیں جو کھلی تحریف ہے۔ ہم ان کو دعوت دیتے ہیں (کہ وہ اسلامی فقہ کے اس عظیم ذخیرہ کا مطالعہ کریں)، لیکن وہ اس عظیم الشان دین کو سمجھنے اور اس کی تعلیمات سے بہرہ ور ہونے سے قاصر ہیں۔

ان مستشرقین میں انصاف پسند بہت کم ہیں۔ یہ بے شک اسلامی فقہ کو

---

[1] واضح رہے کہ بنو امیہ کے عہد میں اندلس کے مسلمان یلغار کرتے ہوئے [illegible] میں فرانس کے وسطی شہر تور (TOURS) تک پہنچ گئے تھے جو پیرس سے تقریباً ۱۵۰ میل جنوب میں ہے، اور فرانس کی مشرقی سرحد میں لیون (LYONS) تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ اس کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کے دور میں مسلمان جب مشرق کی طرف سے یورپ پر حملہ آور ہوئے تو وہ ۱۶۸۳ء میں وسطی یورپ تک پہنچ گئے اور آسٹریا کے دارالحکومت ویانا (VIENNA) کا محاصرہ کر لیا۔
(معراج محمد)

کا حق، سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مانتے ہیں کہ وہ انسانوں کے لئے ایک عادلانہ قانون ہے۔ جو اس دنیا میں مزید قانون سازی کے لئے بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔ لیکن جب بھی اس عظیم فقہِ اسلامی نے اس منزل کی طرف چلنے کے لئے راستہ بنایا تو یورپ میں وہاں کے خود غرضوں نے اس کے راستہ میں کانٹے بچھائے اور دوسری رکاوٹیں کھڑی کرنی شروع کیں تاکہ وہ اپنی قوموں کو اس کے قبول کرنے سے باز رکھیں۔ بے شک مسلم علماء کی رہنمائی اور طالبینِ حق کی کوششوں سے اتنا تو ہوا کہ قانون سے متعلق بعض (عالمی و بین الاقوامی) کانفرنسوں میں منکسرانہ انداز میں چند ایسی قراردادیں پیش ہو کر منظور ہوئیں جن میں اِس حقیقت کا اعتراف کیا گیا کہ شریعتِ اسلامی ایک منفرد و مستقل نظامِ قانون ہے جس کو حالاتِ حاضرہ پر منطبق کیا جا سکتا ہے اور یہ معاشرہ کی بیماریوں کے علاج اور ان کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ قرارداد بے شک منکسرانہ ہے کہ اس میں صرف اس کے صلاحیت رکھنے کا اعتراف کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایسی ابتداء ہے جو لامحالہ اس کو اپنی انتہا اور منطقی نتیجہ تک پہنچا کر رہے گی۔ مثل مشہور ہے کہ "بارش کے وقت پہلے بوندا باندی ہوتی ہے، پھر موسلا دھار بارش ہونے لگتی ہے۔"

ائمۂ فقہ

اسلامی تاریخ میں فقہ کے ائمہ یا ائمۃ المذاہب اِس حیثیت سے سامنے آئے کہ وہ فقہِ اسلامی کے شارح ہیں، اور اس کا متن کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہؓ ہیں۔ یہی تینوں چیزیں فقہِ اسلام

کی شاہد، رسالت کا مظہر اور شریعتِ محمدیہ کا مینار ہیں۔

ان ائمہ کرام نے اپنی آراء کو ماننا اُمتِ مسلمہ یا اپنے بعد آنے والی نسلوں پر فرض قرار نہیں دیا۔ بلکہ ان آراء کو اس طرح ان کے آگے پیش کیا کہ جو کچھ نصوص (کتاب وسنّت) میں واضح طور پر موجود ہے تو اس کا حکم وہی ہے، اُس میں کوئی تغیر اور تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ اِس پر ان سب کا اجماع ہے۔ البتہ اگر کسی نص کے سمجھنے اور اس کی تعبیر و تفسیر میں اختلاف کی گنجائش ہو تو وہ الگ بات ہے۔

اور جو کسی فقیہ کی رائے ہو تو وہ رائے ہی رہے گی اور وہ اس لئے پیش کی جاتی ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ جو بہت زیادہ رائے استعمال فرماتے ہیں اور جنہوں نے قیاس و رائے کے ذریعہ بہت سے مسائل اور ان کے احکام کا استنباط کیا ہے، فرماتے تھے،

هٰذَا اَحْسَنُ مَا وَصَلْنَا اِلَيْهِ	یہ بہتر سے بہتر (استنباط) ہے جس تک ہم
فَمَنْ رَاٰى خَيْرًا مِّنْهُ	پہنچے ہیں۔ اگر کسی کو اس سے بہتر کوئی حل یا حکم نظر
فَلْيَاْخُذْ بِهٖ۔	آئے تو وہ اس پر عمل کرے۔

ایک مرتبہ آپؒ کے مستنبط کئے ہوئے فقہی مسئلہ کے بارے میں کسی نے آپ سے پوچھا،

اَهٰذَا هُوَ الْحَقُّ الَّذِيْ	کیا یہ ایسا حق ہے جس میں کوئی شک نہیں؟
لَا شَكَّ فِيْهِ؟	

آپؒ نے جواب دیا،

لَا اَدْرِيْ لَعَلَّهُ الْبَاطِلُ	مجھے نہیں معلوم ممکن ہے یہ وہ باطل ہو جس کے باطل
الَّذِيْ لَا شَكَّ فِيْهِ۔	ہونے میں کوئی شک نہ ہو۔

الغرض ان تمام ائمہ کا حال اپنی رائے اور استنباط کے بارے میں وہی تھا جو بعد کے فقہاء نے ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے اور یہی جملہ ان سب کے زبان زد تھا:

رَاْيُنَا صَوَابٌ يَحْتَمِلُ	ہماری رائے درست ہے البتہ اس میں غلطی کا
الْخَطَاَ وَرَاْيُ غَيْرِنَا خَطَاٌ	امکان ہے اور دوسرے فقہاء کی رائے (ہماری نظر میں)
يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ۔	غلط ہے البتہ اس کے درست ہونے کا امکان ہے۔

ان ائمہ فقہ میں سے بعض حضرات کے مذاہب تو تاریخ کے غار میں گم ہو کر رہ گئے اور ان کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ مثلاً امام اوزاعیؒ فقیہ شام جو امام ابو حنیفہؒ کے ہمعصر تھے۔ اور امام ابن شبرمہؒ فقیہ بصرہ جو وہاں کے قاضی بھی تھے۔ اور قاضی ابن ابی لیلیٰؒ فقیہ کوفہ، اور امام لیث بن سعدؒ فقیہ مصر جن کے بارے میں امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ "وہ امام مالکؒ سے زیادہ فقیہ تھے لیکن ان کے شاگردوں نے ان (کی فقہ) کو قائم و محفوظ نہ رکھا۔"

ان کے علاوہ اور بہت سے ائمہ فقہ گزرے ہیں جن کا مذہب مدوّن شکل میں یکجا نہیں ملتا۔ البتہ ان کے بہت سے اقوال و فتاوٰی دیگر مذاہب کی فقہی کتابوں میں درج ہیں، خصوصاً فقہائے احناف کی کتابوں میں۔ مثلاً قاضی ابن ابی لیلیٰؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے درمیان فقہی اختلاف جس کو امام ابو یوسفؒ تلمیذ امام ابو حنیفہؒ نے یکجا کر کے لکھا[1]۔ یا ان کی دوسری کتاب "الرد علی سیر الاوزاعی" جس میں انہوں نے امام اوزاعیؒ کی "سیر" (بین الاقوامی قانون) سے متعلق آراء و فتاوٰی کا رد لکھا (اور اس ضمن میں امام اوزاعیؒ کے اقوال بیان کئے)

---

[1] اس کتاب کا نام ہے "اختلاف ابی حنیفہ وابن ابی لیلیٰ" (مترجم)

ان ائمہ کرام کی بہت سی فقہی آراء آپ کو ایسی کتابوں میں بھی بکھری ہوئی ملیں گی جن
میں مختلف مذاہب کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے مثلاً ابن قدامہؒ کی "کتاب المغنی"
ابن حزمؒ کی "المحلی"، ابن رشدؒ کی "بدایۃ المجتہد"، امام نوویؒ کی "المجموع" اور
امام سرخسیؒ کی "المبسوط"۔

انہی ائمہ میں سے جن کے مذاہب تاریخ کے اوراق میں گم ہو کر رہ
گئے، ایک امام لیث بن سعدؒ ہیں جن کا ایک اہم مکتوب آج بھی بعض کتابوں
میں محفوظ ہے[1]۔ اس خط میں ان کے اور امام مالکؒ کے مابین بعض فقہی
مسائل پر جواب سوال اور علمی مذاکرہ ہے۔ اس خط سے امام لیثؒ کے تفقہ و
دانشمندی اور علمی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے، اس خط میں اگرچہ فقہی اختلافات
پر گفتگو کی گئی ہے لیکن صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط ایک مخلص طالب علم
کی آواز ہے جو (اختلاف کے باوجود) امام مالکؒ سے محبت رکھتا ہے اور
ان کی مودت سے سرشار ہے۔ اس خط کا پورا علمی مذاکرہ اور فقہی مباحثہ اسی
باہمی محبت کا آئینہ دار ہے۔

ان مذکورہ بالا ائمہ کے فقہی مذاہب کے ناپید ہونے کے دو بڑے
اسباب ہیں:

اوّل تو یہ کہ ان میں سے اکثر ائمہ ایسے شہروں میں مقیم نہیں تھے جہاں
لوگ حصولِ علم کے لئے آتے ہوں اور تلامذہ کا تانتا بندھا رہتا ہو۔ مثلاً
امام اوزاعیؒ کے عہد میں دمشق علمی مرکز نہیں رہا تھا بلکہ علم وہاں سے اٹھ
کر مدینہ اور بغداد چلا گیا تھا۔ اسی طرح امام لیثؒ کے زمانہ کا مصر علم

---

[1] یہ خط امام ابن قیمؒ کی "اعلام الموقعین" میں موجود ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ (مترجم)

اور علماء کی آماجگاہ نہیں تھا۔ وہاں صرف امام مالکؒ کے تلامذہ تھے جو امام
لیثؒ کے شاگردوں سے مقابلہ و مناظرہ کرتے رہتے تھے۔ بالآخر یہی مالکی
ان پر غالب آ گئے۔

دوسرا سبب ان کے ناپید ہونے کا یہ ہوا کہ ان کے شاگرد اتنے قوی
اور باصلاحیت نہیں تھے کہ وہ ان کی آراء و فتاویٰ کو مختلف ممالک میں پھیلاتے
اور ان کے مذہب کا پرچار کرتے یا ان کی آراء و اجتہادات کو جمع کر کے کتابی
شکل میں مدون کرتے، ان کی چھان پھٹک کرتے اور آگے اپنے شاگردوں
کو ان کے مسائل سکھاتے اور لوگوں کے لئے اس مذہب کا سیکھنا اور حاصل
کرنا آسان بناتے۔ اس کے علاوہ ان کی پشت پر کوئی سیاسی قوت
بھی نہیں تھی جو ان کے مذہب کی حامی اور مددگار بنتی۔

ان سب مذاہب میں سے آٹھ مشہور مذاہب ایسے تھے جو تاریخ کی
خطرناک موجوں سے محفوظ رہے۔ ان کے مسائل اور فتاویٰ جمع کر کے یکجا
مدون کئے گئے، اور جہاں جہاں یہ مذاہب پھیلے وہاں کے طلبہ و علماء نے
ان کی کتابوں کے درس قائم کئے۔ بعض جگہ جہاں ان کے پیروؤں کی تعداد
زیادہ ہوتی، اسی لحاظ سے ان کے حلقہ ہائے درس اور مراکز تحقیق بھی وہاں
زیادہ ہوتے۔ ان میں سے بعض مذاہب ایک سے زائد ملکوں میں پھیلے۔ اور
جو مذہب جس ملک میں رائج و مقبول ہوا وہ ساتھ ہی وہاں کے رسوم و رواج
اور عرف و عادات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن یہ اثر پذیری صرف
ان مسائل میں ہوتی تھی جو نص سے ثابت نہیں ہوتے تھے (بلکہ مستنبط اور
مستخرج ہوتے تھے) جیسا کہ ہم حنفی مذہب میں دیکھتے ہیں کہ ارضِ روم (ترکی)

اور ماوراء النہر اور عراقین کی حنفی فقہوں میں عادات اور عُرف کا اختلاف ہے۔ اس کو فقہ کا اختلاف نہیں کہیں گے بلکہ عرف و عادت کا اختلاف کہیں گے۔

اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ مالکی مذہب کا بھی یہی حال ہے۔ اس مذہب کے مغرب (شمالی افریقہ) میں رہنے والے مقلدین اور عراق میں بسنے والے متبعین کے مابین بھی اسی قسم کا فروعی اور جزئی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال حنبلی مذہب میں بھی پائی جاتی ہے کہ خراسان کے حنابلہ اور عراق کے حنابلہ کے مابین بھی اختلاف کی یہی نوعیت ہے۔

الغرض یہ مذاہب گویا دریاؤں کی طرح ایک قطار میں متوازی چل رہے ہیں۔ جو جس زمین پر چل رہا ہے اسی کی مٹی کا رنگ اس کے پانی میں جھلکتا نظر آتا ہے۔

وہ آٹھ مذاہب جن کا حال تاریخ کے اوراق میں محفوظ رہا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

حنفیؒ مذہب، مالکیؒ مذہب، شافعیؒ مذہب اور حنبلیؒ مذہب۔ یہ چاروں مذاہب اکثر اسلامی ملکوں میں پھیل گئے ہیں، اور سُنّی مسلمانوں کی اکثریت انہی چار مذاہب کی پیرو ہے۔

اِن چار (سُنّی) مذاہبِ فقہ کے علاوہ چار مذاہب اور ہیں جن سے اسلامی دنیا خالی نہیں ہے۔ اِن مذاہب کے ماننے والے مختلف اقالیم اسلامیہ میں پھیلے ہوئے ہیں، میرا خیال ہے کہ اکثر ممالک میں یہ اقلیت کی صورت میں بستے ہیں۔

(ان مذکورہ مذاہب میں سے ایک امام زید بن علی زین العابدینؒ (متوفی ۱۲۲ھ) کا ہے (جو زیدیہ کہلاتا ہے) اہلِ بیت کے مذاہب میں سے یہ مذہب سُنّی

مذاہب اربعہ سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ بلکہ اس حد تک قریب ہے کہ اِس مذہب کے صاحبِ تخریج مجتہدین کو جب امام زیدؒ سے منقول کوئی نص نہیں ملتی تو وہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کو اختیار کرتے ہیں۔ اس مذہب کے متبعین یمن اور خراسان میں پائے جاتے ہیں۔

ان میں سے دوسرا مذہب امام ابوعبداللہ جعفر صادقؒ بن محمد باقرؒ کا ہے۔ ان کا انتقال ۱۴۸ھ میں ہوا۔ اور ان سے امام ابوحنیفہؒ نے استفادہ کیا اور احادیث روایت کیں۔ اگر آپ چاہیں تو اس سلسلہ میں امام ابویوسفؒ کی کتاب الآثار اور امام محمدؒ کی کتاب الآثار دیکھیں۔ ان دونوں کتابوں میں آپ کو امام ابوحنیفہؒ کی امام جعفر صادقؒ سے مروی روایات ملیں گی۔ ان کے بارے میں خود امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ "میں نے لوگوں کے (فقہی) اختلافات کو جعفر بن محمدؒ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں دیکھا"۔ ان کا مذہب عراق و ایران کے شیعہ حضرات میں مقبول ہے اور انڈونیشیا، پاکستان، اور ہندوستان کے شیعہ حضرات کا بھی یہی فقہی مسلک ہے۔

ان میں سے تیسرا مذہب امام داؤد ظاہری کا ہے جو امام شافعیؒ کے شاگرد تھے۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے فقہی اجتہاد و استنباط کو صرف نصوص تک محدود رکھا اور اس کی بنیاد صرف قرآن و سنّت کو قرار دیا۔ (قیاس اور مصالح مرسلہ وغیرہ کو ترک کر دیا) ان کے مذہب (ظاہری) کو ان کے بعد امام ابنِ حزم (اندلسی) نے مدوّن کیا، اور انہوں نے نص سے تمسک کرنے میں (اپنے پیشوا) داؤد سے بھی زیادہ سختی کا مظاہرہ کیا، اور اس سلسلہ میں اپنی مشہور کتاب "المحلّٰی" لکھی۔ اگرچہ معلوم نہیں کہ اندلس میں مُوحّدین کے دورِ حکومت کے بعد کسی نے اس کتاب پر عمل کیا یا نہیں، لیکن یہ فقہ اسلامی کی بڑی جامع کتاب ہے، بلکہ اسلامی قانون اور

اس کے مسائل کا ایک "دیوان" ہے جیسا کہ وہ خود اس کو اسی لقب سے پکارتے ہیں۔

ان میں سے چوتھا مذہب اباضیہ ہے جو عبد اللہ بن اباض کی طرف منسوب ہے۔ یہ مذہب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر مبنی ہے اور اہلِ سنّت کے مذہب سے اس کا اختلاف صرف فروعات میں ہے[1]۔

اسلامی تاریخ میں مذکور ہے کہ عبد اللہ بن اباض اس خارجی فرقہ کے امام ہیں جو عامّۃ المسلمین کی تکفیر نہیں کرتے۔ یعنی مسلمانوں کی جن خطاؤں اور غلطیوں کا ذکر کرتے ہیں ان کی وجہ سے ان کو کافر قرار نہیں دیتے، بلکہ کہتے ہیں کہ وہ (ان غلطیوں کی وجہ سے) کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

---

[1] یہ مذہب عبداللہ بن اباض مری التمیمی (متوفی ۸۶ھ) کی طرف منسوب ہے۔ اباضیوں نے امویوں کے خلاف کئی بار علم بغاوت بلند کیا بالآخر ۱۲۹ھ میں یمن اور حضرموت پر اپنا تسلط قائم کیا، پھر ۱۳۴ھ میں عمان میں عباسی خلیفہ ابو العباس السفاح کی فوجوں سے مقابلہ ہوا۔ ان کا مذہب قبائل بربر میں خوب پھیلا حتیٰ کہ وہاں ان کے سردار عبدالرحمٰن بن رستم نے ۱۴۴ھ/۷۶۱ء میں اپنی حکومت بھی قائم کر لی جو دولتِ رستمیہ کہلائی اور ۱۵۲ سال قائم رہی۔ اس کا دارالحکومت تاہرت تھا۔ اور اس کے دائرۂ اقتدار میں موجودہ الجزائر کا بیشتر حصہ، وہران، جبال اوراس، تونس کا جنوبی نصف حصّہ اور لیبیا کا بیشتر علاقہ شامل تھا۔ بالآخر ۲۹۶ھ/۹۰۸ء میں شیعہ فاطمی خلافت کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ یہ خوارج کا سب سے اعتدال پسند فرقہ شمار ہوتا ہے۔ آج کل اس مذہب کے متبعین شمالی افریقہ کے وسیع علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، خصوصاً لیبیا، الجزائر اور تونس میں۔ اس کے علاوہ یہ زنجبار میں بھی آباد ہیں اور عمان میں ان کی اکثریت ہے جہاں ان کی امامت و سیادت اب بھی قائم ہے۔ (سراج مترجم)

یعنی کافرِ نعمت ہیں۔

لیکن ان کے متبعین جو بعض جزیروں اور نخلستانوں (واحات[1]) میں رہتے ہیں، کہتے ہیں کہ وہ تابعی تھے اور خارجی ہرگز نہیں تھے۔ بہرحال تاریخی حیثیت سے وہ کچھ بھی ہوں، یہ حقیقت ہے کہ ان کا (فقہی) مذہب ایک مدوّن شکل میں موجود ہے اور (مسائل و فروعات سے) مالامال ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصر کے قانونِ میراث مجریہ ۱۹۴۳ء کی دفعہ ۳۳ میں دیگر مذاہب کے علاوہ اس مذہب (اباضیہ) سے بھی قانون اخذ کیا گیا ہے، اگرچہ تھوڑا ہی کیا گیا ہے۔

ائمۂ اربعہ

ان ائمۂ مذاہب اربعہ کے مناقب پر ان کے متبعین نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان ائمہ اربعہ کے علاوہ جن ائمہ کا ہم نے ان سے پہلے ذکر کیا ہے، ان میں سے بھی ہر ایک کے مناقب و فضائل پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ سب ذخیرہ ان کے مختلف حالات معلوم کرنے کا تو بے شک ایک اچھا ذریعہ ہے، لیکن یہ ان کی سوانح عمری مسلسل تاریخ وار پیش نہیں کرتا اور نہ ان کی زندگی کے مختلف ادوار سے بحث کرتا ہے، نہ ان کی پوری تعلیمات و نظریات کا جائزہ لیتا ہے اور نہ ان کے مذہب کے پھیلنے کا حال بیان کرتا ہے۔

---

[1] الواحات (واحد: واحۃ) کے لغوی معنی نخلستان ہیں اور یہ عرب دنیا میں کئی علاقوں کا نام بھی ہے۔ لیکن یہاں صحرائے اعظم کے واحات (نخلستان) مراد ہیں۔ مترجم۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مناقب میں مسلّم حقائق کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی مبالغہ آرائیاں بھی خلط ملط ہو گئی ہیں، جیسا کہ آپ امام رازی کی کتاب "مناقب امام شافعیؒ" اور کردری مکیؒ کی کتاب "مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہؒ" وغیرہ میں دیکھیں گے۔ مزید یہ کہ کتب مناقب دراصل بکھری ہوئی معلومات کا مجموعہ ہیں جن کو نئے سرے سے علمی طریقہ پر مختلف عنوانات کے تحت مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ان تحریروں میں کسی واقعہ یا امر کے اسباب وعلل سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ ان کتابوں میں ایسا دقیق علمی تجزیہ اور تحقیقی بحث مفقود ہے جس کے ذریعہ قاری ان بیان کردہ حالات کو اس زمانہ پر منطبق کر سکے۔ اس وقت تو صورت حال یہ ہے کہ آپ جب ان مناقب کا مطالعہ کریں گے تو محسوس ہوگا کہ ان ائمہ کرام نے جو کچھ علمی گفتگو کی ہے اور مسائل بیان کئے ہیں، ان کا کوئی ظاہری سبب نہیں تھا، بلکہ وہ ائمہ نے صرف اپنے دل کی تسلی کے لئے (فرضی طور پر) بیان کئے ہیں، گویا وہ ایک علم لدنّی کا اظہار ہے (اس وقت کے معاشرہ کے مسائل کے جواب میں بیان نہیں کئے گئے ہیں)۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ گزشتہ صدی میں علمی دنیا میں ائمہ کرام کی تاریخ اور ان کی سوانحِ عمری سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے لیکن اب جو کتابیں اس موضوع پر لکھی جا رہی ہیں ان میں علمی اور تحقیقی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو ہر واقعہ کے اسباب وعلل سے بحث کرتا ہے اور اس کے جو اثرات معاشرہ پر مترتب ہوتے ہیں ان کا بھی جائزہ لیتا ہے۔

اس علمی انداز میں لکھی گئی پہلی کتاب جو میری نظر سے گزری وہ علامہ

احمد تیمورؒ کی "المذاہب الفقہیۃ الاربعۃ" ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کتاب پر تبصرہ کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم اس کے لائق مصنف کے بارے میں اپنی یادداشتیں بیان کریں۔

علامہ احمد تیمورؒ

ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں دو عظیم علماء کے نام علمی مجالس میں کثرت سے لئے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب تو ایسے تھے جن سے ہماری ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی، بلکہ ان کے دیکھنے کو ہم ترستے تھے۔ یہ تھے "علامہ احمد تیمور"۔ اور دوسرے صاحب بے شک بعض علمی مجالس میں نظر آجاتے تھے، اور ان کے مضامین بھی رسالوں اور مجلّوں میں پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ یہ تھے علامہ مرحوم "احمد زکی"۔

جس زمانہ میں ہم قضائے شرعی کے مدرسہ میں تاریخ کا درس لے رہے تھے اس وقت جب بھی ہمیں کسی تاریخی شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مشکل پیش آتی اور ہمارے محقق استاد بھی اس سلسلہ میں دقت محسوس کرتے تو ہم یہ تجویز پیش کرتے کہ اس کے بارے میں کسی مجلّہ کے ذریعہ علامہ احمد زکی صاحب سے سوال کیا جائے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ فوراً اس سوال کا جواب دیتے۔ گویا وہ اس کے لئے ایسے تیار بیٹھے ہوں جیسے ایک سپاہی جنگ کے لئے بس نقارہ بجنے کا منتظر رہتا ہے۔

دوسری جانب علامہ "احمد تیمور" کا یہ حال تھا کہ جب ہم بالاصرار ان سے کوئی علمی بات پوچھتے تو بے شک وہ اس کا جواب دینے پر خوشی سے آمادہ ہو جاتے لیکن جہاں تک منظرِ عام پر آنے کا تعلق ہے تو وہ صرف

انہی مخصوص علمی مجالس میں نظر آتے تھے جن میں بلند پایہ علماء شریک ہوں، طلبہ موجود نہ ہوں، خواہ وہ طلبہ کتنے ہی فاضل اور ماہر ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم جیسے طلبہ میں ان کا نام بڑی قدر و منزلت سے لیا جاتا تھا۔ ان کی لائبریری اور اس میں موجود نادر کتب و مخطوطات کا ذکر ہوتا تھا۔ ان کی اسلامی علوم سے واقفیت اور علماء کرام سے ان کے گہرے روابط و تعلقات کا تذکرہ ہوتا تھا۔ نیز علماء سے ان کے علمی مذاکرات، اور علوم اسلامی کے لئے ان کے ایثار و قربانی اور علمی خزانوں کے حصول کے لئے ان کے بے دریغ روپیہ خرچ کرنے کا چرچا ہوتا تھا۔ انہوں نے جس طرح کوشش اور محنت کر کے ان علمی خزانوں کو، خواہ وہ قلمی مخطوطات کی صورت میں ہوں یا مطبوعہ شکل میں، ہر جگہ سے حاصل کیا۔ اعلیٰ سرکاری مناصب کو ترک کیا تاکہ اسلامی علوم کے لئے اپنے آپ کو فارغ کر سکیں، اور ان علوم کے احیاء اور لوگوں میں ان کی اشاعت کے لئے پُرسکون عالمانہ انداز اور با اعتماد طریقہ پر کوشش اور جدوجہد کی، ان سب باتوں کا ہر شخص کی زبان پر چرچا تھا۔

علامہ مرحوم نے اپنے علم کی تکمیل کی ابتداء اکابر علماء کی مدد سے کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے شیخ حسن طویل جیسے متفکر و زاہد اور اعلیٰ پایہ کے علماء کا تعاون حاصل کیا۔ اپنی جاگیر اور باغات کا ایک حصہ اپنے شیخ کے لئے مخصوص کر دیا، یہاں وہ ہر ہفتہ اکٹھے بیٹھتے۔ علمی الجھنوں اور مشکلات پر باہم مذاکرہ کرتے، منطق اور اصول کی گتھیوں کو سلجھاتے، عقلی و نقلی دلائل سے بحث کرتے۔

انہوں نے شیخ محمد عبدہٗ سے بھی رابطہ قائم کیا۔ اپنے گھر کو ان کے تلامذہ کی باہمی ملاقات کا مرکز بنایا۔ شیخ محمد عبدہٗ بھی اپنے ان تلامذہ کے

درس و تدریس کے معاملہ میں بڑے دریا دل تھے۔ وہ ان کو ان تمام علوم کا درس دیتے جن سے انہوں نے جامعہ ازہر میں حق کی روشنی پھیلائی اور طلبہ کو صحیح اسلامی زندگی کی راہیں دکھائیں۔

علامہ احمد تیمور کی زندگی ایک روشن نور سے عبارت تھی۔ وہ ایک فیض جاری کی طرح تھے۔ اہلِ علم حضرات اُن سے متعارف اور ان کے گرویدہ تھے۔ لیکن ان کے قریبی دوست صرف خواص علماء ہی ہو پاتے تھے۔

علامہ احمد تیمور کی وفات

یہ پُرسکون شخصیت اسلامی علوم کے خزانوں کے مطالعہ اور ان کے حصول بعد انکشاف میں اسی طرح انتھک طریقہ پر مستقل مزاجی سے مشغول رہی۔ یہ بغیر کسی شور و شغب اور دھوم دھام کے خاموشی کے ساتھ تحقیقی کام کرتی رہی بالآخر ۱۳۴۸ھ کے موسم گرما کے اوائل میں (علم کی) یہ روشن شمع بجھ گئی۔ جب بین کرنے والوں کی آوازیں گونجیں (اور تعزیتی بیانات شائع ہوئے) تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ اسلام کی جس عظیم شخصیت سے وہ محروم ہوئے ہیں اس کا کیا مقام تھا۔

میں اس زمانہ میں اپنے چند بزرگ شیوخ و اساتذہ کی مجلس میں بیٹھا کرتا تھا۔ ان حضرات کی علامہ مرحوم سے دوستی تھی اور وہ ان سے اکثر تبادلہ خیال بھی کیا کرتے تھے۔ میرا معمول ہو گیا تھا کہ میں ان معزز اصحاب کی مجلس سے استفادہ کرتا اور ان کی باتوں کو سن کر اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا۔ ان حضرات کی محفل روزانہ منعقد ہوتی تھی جس میں یہ مختلف موضوعات پر علمی گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ کوئی لگی بندھی گفتگو نہیں ہوتی تھی کہ

کسی ایک فن یا موضوع تک محدود رہے، بلکہ یہ ایک قسم کی غیر رسمی دوستانہ نشست ہوتی تھی جس میں بے تکلفانہ انداز میں مختلف ادبی اور دینی موضوعات پر ہم خیال احباب اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اِس میں ادبی چٹکلے بھی ہوتے تھے، اور اسلامی مسائل پر علمی بحث بھی، نیز علمی رسائل و جرائد میں جدید مصنفین کے جو مقالات و مضامین شائع ہوتے تھے ان پر تنقید و تبصرہ بھی۔ خصوصاً ان جدید مقالہ نگاروں کے ادبی تسامحات اور علمی لغزشوں پر خوب لے دے ہوتی تھی۔

لیکن جس روز علامہ احمد تیمور مرحوم کا جنازہ اٹھا، اُس شام کو اِس مبارک محفل کا موضوع صرف آپ کی شخصیت تھی۔ اِس محفل کے بعض شرکاء آں کے ہمسایہ تھے، اور بعض ان کے قریبی دوست تھے اور بعض وہ حضرات بھی تھے جو ان سے علمی استفادہ کرتے تھے اور مشکل مسائل کی بابت ان سے استفسار کیا کرتے تھے۔ ہم سب اہلِ محفل برابر تین رات تک انہی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، کسی اور موضوع کو چھیڑا ہی نہیں گیا، اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ان ہی کا ذکر آجاتا تھا کیونکہ وہ بھلائے نہیں بھولتے تھے۔

ہم عصر شخصیات کے بارے میں علامہ احمد تیمورؒ کے مقالات ایک ادبی مجلہ میں مسلسل شائع ہوتے تھے۔ میں جب اُن کو پڑھتا تھا تو ان کی تحریر کی بہت سی خوبیاں اجاگر ہوتی تھیں، مثلاً سچے واقعات بیان کرنا، ان کی باریکیاں واضح کرنا، ہر واقعہ کی سند کا ذکر کرنا، الفاظ ایسے واضح اور تلے جو سہل ممتنع کہلائیں، عبارت ایسی آسان کہ عوام الناس کی ذہنی سطح سے بالا نہ ہو، اور نہ ایسی گری ہوئی کہ خواص کے کانوں کو بُری لگے۔ مضمون ایسا جامع کہ پڑھنے

والا اُس شخصیت کے عہد کا پورا منظر اپنی آنکھوں سے تصویر کی طرح دیکھ لے۔ اُس عہد کے پس منظر میں اس شخصیت کے پورے خد و خال اور اس کے فکری سفر کی پوری کہانی تمام تفصیلات اور باریکیوں کے ساتھ واضح طور پر سامنے آجاتی تھی۔

درحقیقت علامہ احمد تیمورؒ نے مختلف علمی جرائد و کتب میں اپنی یہ تحریریں شائع کر کے ان علمی شخصیات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا اور ان کو وہ حق دیا جس کے وہ حقدار تھے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اگر علامہ احمد تیمورؒ قلم نہ اٹھاتے تو امام مستوفی نوادی کے حالاتِ زندگی سے کون واقف ہوتا؟ تاریخ نے اب اس عظیم شخصیت کے ایسے کارنامے اپنے صفحات میں محفوظ کر لئے ہیں جو علمی خدمات کا درخشاں باب ہیں۔

میں پھر پوچھتا ہوں کہ اگر علامہ احمد تیمورؒ کی تحریریں نہ ہوتیں تو ایک ایسے عالم کو کون جانتا جس کو عزت و منزلت صرف اس کے علم نے بخشی اور چاردانگِ عالم سے لوگ اس سے ملنے کے لئے صرف اس کے علم کی وجہ سے آتے تھے۔ یہ تھے امام حسن الطویل۔

ہمارے وہ علماء اور شیوخ جن کے مرتبہ کی بلندی کا مدار علم اور صرف علم ہے، عوام الناس میں ان کو وہ شہرت نہیں ملتی جو دوسرے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے یہ صرف علامہ احمد تیمورؒ کی علم اور اہلِ علم سے وفا اور قدردانی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے ایسی علمی شخصیات کے تذکرہ کو کتابوں اور رسالوں میں شائع کر کے دوام بخشا۔

جو لوگ علامہ احمد تیمورؒ سے پہلے وفات پاگئے اور ان کی علامہ سے ملاقات

بھی ہوئی وہ تو بڑے خوش نصیب نکلے (کہ انہیں علامہ مرحوم جیسا تذکرہ نویس مل گیا)۔ لیکن جو لوگ اُن کے بعد آئے وہ بیچارے ایسے انصاف پسند تذکرہ نویس سے محروم ہیں جو ان کے علم وفضل کی صحیح قدردانی کرسکے اور ان کی علمی ودینی خدمات کا تذکرہ کتب ورسائل میں شائع کرسکے۔ جبکہ صورت حال اب یہ ہے کہ ان سے علم وفضل میں فروتر اور نالائق لوگوں کا شہرہ عام ہے جن کی نہ کوئی دینی خدمات ہیں اور نہ علمی اور معاشرتی کارنامے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اب کوئی منصف محقق ہے جو علم وفضل کے اصل حاملین کو ان کا حق دے سکے اور لوگوں میں ان کو متعارف کرا سکے جیسا کہ علامہ احمد تیمورؒ مرحوم نے ان کے برگزیدہ اسلاف کے ساتھ انصاف کیا اور ان کی قدردانی کا حق ادا کیا۔

یہاں یہ بات عرض کردوں کہ جن بزرگ علماء کی زندگی میں ہم ان سے ملے ہیں اور ان کے علوم ومعارف سے سیراب ہوئے ہیں اور جنہوں نے ہمارے علوم وافکار کو صاف ستھرا رکھنے میں، اور ہر قسم کے شکوک واوہام اور انحراف سے محفوظ رکھنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، وہ ہماری تاریخ کی امانت ہیں اور ان کے حالات زندگی اور کارناموں کا تذکرہ عام کرنا ہم پر فرض ہے۔

علامہ احمد تیمورؒ کی تحریریں:

علامہ احمد تیمورؒ کی تحریروں میں تین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ بلکہ ہمارے زمانہ میں یہ خصوصیات صرف انہی کی تحریروں میں ملتی ہیں:

پہلی خصوصیت: درست الفاظ کا استعمال، انہوں نے جہاں بھی کوئی لفظ استعمال کیا ہے اس معنی کے لئے وہی لفظ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا کہ وہ اسی معنی کے لئے وضع ہوا ہے۔ دوسرے کسی لفظ کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس لفظ کو وہاں سے ہٹا کر کوئی دوسرا لفظ رکھ دیں تو عبارت کی وضاحت میں مشکل پیش آئے گی اور صحیح مطلب سمجھنے میں الجھن اور پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اگر ان کی عبارت کو اصل شکل میں رکھا جائے تو وہ نہایت آسان اور ہر لحاظ سے مکمل نظر آئے گی۔

دوسری خصوصیت: بغیر کسی جھول کے ایجاز۔ جب آپ ان کی تحریر پڑھیں گے تو محسوس کریں گے کہ انہوں نے اس میں جس مطلب کو واضح کرنے کا قصد کیا ہے اس کے قلیل ترین حصہ کو بھی واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ اور یہ بھی بغیر کسی ابہام کے۔ اس قسم کا مکمل ایجاز دراصل اطناب مرسل سے بھی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ اطناب میں تو یہ ہوتا ہے کہ جیسے جیسے معانی اور مطالب ذہن میں آتے جاتے ہیں لکھنے والا ان کو سپرد قلم کرتا رہتا ہے۔ وہ یہ سوچنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کرتا کہ الفاظ وہ استعمال کئے جائیں جو مطلوبہ معانی سے زیادہ وسعت رکھتے ہوں اور ایسے مناسب و موزوں ہوں کہ دوسرا لفظ ان کی جگہ نہ آسکے۔ بغیر جھول کا ایجاز وہی ہوتا ہے جس میں الفاظ تھوڑے استعمال کئے جائیں لیکن معنی کے لحاظ سے وہ بہت جامع ہوں اور عبارت میں کوئی جھول بھی پیدا نہ ہو۔ اس مقام پر مجھے مرحوم سعد زغلول کا ایک جملہ بڑا بھلا لگتا ہے جو انہوں نے اپنے کسی دوست کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔ اس خط میں اطناب تھا (یعنی مضمون کو بہت پھیلا کر بیان کیا گیا تھا)۔ انہوں نے اس خط کے آخر میں لکھا: "میں نے اس خط میں جو اطناب سے کام لیا ہے اس میں مجھے معذور سمجھیں کیونکہ میرے پاس ایجاز

کے لئے وقت نہیں ہے۔"

تیسری خصوصیت: عبارت میں پُرسکون جمال۔ اگرچہ بعض اوقات ان کے جملوں میں الفاظ کی چمک دمک نہیں ہوتی، لیکن اکثر یہ عبارتیں الفاظ کے جمال اور حقائق و معانی کے جلال کا ایک حسین امتزاج پیش کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اندازہ ہی نہیں لگا سکتا کہ آیا یہ عبارت صرف اپنے حسنِ معانی کی وجہ سے اچھی لگ رہی ہے یا اس میں الفاظ کے حسین لباس کے علاوہ بھی کوئی اور چمک دمک کا سبب ہے۔ اس جمال و رعنائی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر بڑی مرتب ہوتی ہے اور اس کی بندش چست ہوتی ہے۔ اس میں ہم آہنگی اور موزونیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

کتاب "مذاہب اربعہ"

ماہ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جامعہ قاہرہ کے "لا کالج" میں شرعی قوانین کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ڈپلومہ کا کورس شروع کیا گیا کیونکہ اس کا وجود اس وقت کی علمی ضرورت تھی۔ جب اس کورس کے طلبہ شرعی قوانین کی طرف متوجہ ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کو اس موضوع پر ایک مقالہ لکھنے کو کہا گیا تو ان میں سے بعض طلبہ کو مصادر و ماخذِ شریعت کا سمجھنا اور اس کی پیچیدگیاں حل کرنا دشوار معلوم ہوا۔ لہٰذا ایسی تدریس کی ضرورت محسوس ہوئی جو اس سلسلہ میں ان کی صحیح رہنمائی کر سکے اور ان کے لئے یہ کام آسان کر سکے۔ کیونکہ اب لوگوں کی نگاہیں قاہرہ کے "لا کالج" کی طرف لگی ہوئی تھیں تاکہ وہ علم شریعت کے اس تازہ اور میٹھے چشمہ سے سیراب ہو سکیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ قانون کے طلبہ کے لئے شریعت کی تعلیم کو بہت غور و خوض کے بعد آسان بنایا جائے تاکہ وہ اس

سلسلہ میں صحیح تحقیقی طریقِ کار پر گامزن ہو سکیں۔ اس مقصد کے لئے یہ ضروری ٹھہرا کہ قدیم مجتہدین کے حالات و تعلیمات کے بارے میں تدریس کا آغاز کیا جائے تاکہ ماضی اور حال کو باہم ملایا جا سکے اور طلبہ مشرق کے نورِ علم سے اور اس کے ثمرات سے مستفید ہو سکیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو شریعت کے ڈپلومہ کا یہ کورس طلبہ اور محققین کی اُمیدوں کا مرکز بن گیا۔

اس کورس کے طریقِ کار کو طے کرتے وقت ماہرینِ قانون اور کالج کے اساتذہ شریعت پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جس کے سربراہ ہمارے استاذ محترم جناب احمد ابراہیم مرحوم تھے۔ حسنِ اتفاق سے یہ علامہ احمد تیمور" کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور مشرق کے چیدہ علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اس کورس کو پڑھانے کا طریقِ کار یہ ٹھہرا کہ ہر سال مذاہبِ مشہورہ کے اماموں میں سے ایک مجتہد کو لیا جائے اور ان کے وہ اصول پڑھائے جائیں جو فقہ اسلامی کے فکری گوشوں میں سے ایک گوشہ تصور کئے جاتے ہیں، لیکن مصادر و ماخذِ فقہ اسلامی سے زیادہ دور نہ جایا جائے اگرچہ ان مصادر کے گرد مختلف نظریات قائم کئے گئے ہوں۔ کیونکہ ہر ایک انہی مصادر سے خوشہ چینی کرتا ہے اور انہی سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے، پھر درختوں اور پھلوں کی طرح بعد میں یہ مختلف رنگ اختیار کرتے ہیں، اگرچہ فی الجملہ ان کا ذائقہ ایک جیسا ہوتا ہے، کیونکہ ان کا سرچشمہ ایک ہے اور مٹی زرخیز ہے اور ان کے بیج ہم شکل ہیں، اور ان سب کا پھل صحت بخش ہے، کیا نفع اور مضرِ صحت نہیں ہے۔

اس کورس کے سلسلہ میں مجھے بھی ایک مجتہد کے بارے میں تحقیق کا

کام سپرد ہوا۔ میں اس تحقیقی کام میں سیدھی راہ چلا۔ یا میں نے خیال کیا کہ یہی سیدھی راہ ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس مجتہد کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں کثیر مواد بھرا پڑا ہے، بلکہ بعض اوقات تو وہ مواد ایک انبار نظر آیا جس میں ہیرے اور پتھر خلط ملط ہو گئے تھے اور ان کو چھننا اور جانچنا آسان کام نہیں تھا۔ اور اصول و نظریات تو اور بھی نیچے دبے ہوئے تھے۔

اس تحقیقی کام میں یہ مشکل تو اپنی جگہ تھی، لیکن اس سلسلہ میں اس سے بھی زیادہ جس تحقیق نے مجھے تھکا مارا وہ ان ملکوں اور شہروں کا تعین تھا جن کے باشندوں نے ان فقہی مذاہب کو قبول کیا، خواہ وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ اس مذہب کے زیر اثر علاقوں کا علم ہو جائے اور ان ملکوں اور معاشروں کا بھی علم ہو جائے جن کے رسم و رواج اور عرف و عادات کو اس مذہب نے غیر منصوص امور میں لیا۔ کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے مسلمانوں کے حالات کا علم رکھنا ہے جو ہر ایسے مسلمان کے لئے ضروری ہے جو علوم اسلامی کا طالب علم ہو۔ نیز حدیث نبوی میں بھی آیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَن لَم یَھتَمّ بالمسلمین فلیس منھم "جس کو مسلمانوں کی فکر نہ ہو وہ ان میں سے نہیں ہے۔"

بہر حال اس مقصد کے لئے میں نے تمام لائبریریوں کو چھان مارا۔ میں اس سلسلہ میں ایسی کتاب کی تلاش میں تھا جو زیادہ ضخیم نہ ہو بلکہ چھوٹی سی ہو۔ بالآخر مجھے میرے مقصد کی چند کتابیں مل گئیں جن میں سے بعض تراجم علماء پر مشتمل تھیں اور ایک علامہ احمد تیمور کی یہ کتاب "المذاہب الفقہیۃ الاربعۃ" تھی۔ انہی کتابوں سے میری مشکل آسان ہو گئی اور مطلب حل ہو گیا۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف کرنا میرا فرض ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے مذاہب اربعہ پر جن کتابوں کے لکھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے ان کی تحریر میں استاذ احمد تیمور مرحوم کی اس کتاب کا بہت بڑا حصہ ہے، میں نے دیگر بہت سی کتابوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔

اس کتاب میں جو حجم میں چھوٹی اور مواد کے لحاظ سے بہت بڑی ہے، میں نے وہ حقائق و مضامین پائے جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں ہر بات بلا کم و کاست مستند حوالہ سے بیان کی گئی ہے، یہ کام ایسے پختہ اور مستند عالم کے بس کا ہوتا ہے جو خفی اور جلی سب طرح کے حقائق کا کھوج لگانا جانتا ہو۔

کتاب کا جائزہ

اس کتاب کا آغاز ایک مختصر سے مقدمہ سے ہوتا ہے جس میں فقہ اسلامی کی تاریخ اور اس کے سرچشموں کا ذکر ہے۔ پھر وہ ائمہ اربعہ میں سے سب سے بڑے امام یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ذکر کرتے ہیں، ان کے مولد و وطن اور تلامذہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ ان شہروں اور ملکوں کے نام بیان کرتے ہیں جہاں جہاں ان کا مذہب پھیلا۔ ان کے اصحاب کے عہدۂ قضاء پر فائز ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر تفصیل سے یہ بیان کرتے ہیں کہ کن کن شہروں اور ملکوں میں ان کے مذہب اور دیگر مذاہب میں رقیبوں کی حیثیت سے مقابلہ ہوا۔ پھر خاص طور سے ملک مصر میں دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اس مذہب کا مقام بیان کرتے ہیں۔ پھر سب ملکوں میں اس کے پھیلاؤ کا ذکر کرتے کرتے ایسے ملکوں کا بھی ذکر کرتے ہیں

جہاں یہ اقلیت میں رہا یا جہاں اس مذہب کے مقلدین کا صحیح تناسب معلوم نہیں ہو سکا یا جہاں اس کے وجود کا ہی علم نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جگہ آپ فرماتے ہیں:۔

"اب رہا دیگر شہروں اور ملکوں میں مذہب حنفی کے داخل ہونے کا حال تو اس سلسلہ میں سب سے زیادہ معلومات ہمیں اس کے چوتھی صدی میں فروغ پانے کے حالات سے ہوئی ہے جس کو مقدسی نے اپنی کتاب "احسن التقاسیم" میں ہر اقلیم کا حال بیان کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یمن میں اہل صنعاء اور صعدہ کی اکثریت کا یہی مذہب تھا۔ اور عراق کے اکثر فقہا اور قضاۃ کا بھی یہی مذہب تھا۔ ملک شام میں تو اس مذہب کو اس قدر تسلط حاصل تھا کہ وہاں کا کوئی قصبہ یا شہر بمشکل ایسا ملتا تھا جس میں کوئی حنفی نہ ہو۔ وہاں کے قضاۃ بھی اکثر حنفی ہوتے تھے، البتہ فاطمیوں کے دور میں وہاں اکثر امور فاطمی مذہب کے مطابق طے ہوتے تھے جیسا کہ فاطمی عہد میں مصر کا حال تھا۔"

پھر وہ اسی طرح ان علاقوں کا ذکر کرتے جاتے ہیں جہاں یہ مذہب رائج تھا اور جہاں بالکل ناپید تھا۔

پھر وہ مالکی مذہب کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو مذہب "اہل حدیث" کے لقب سے پکارتے ہیں۔ اس کے اصل وطن یعنی مدینہ کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر بغداد میں اس کے ظہور اور چوتھی صدی ہجری میں اس کے زوال پذیر ہونے کا حال بیان کرتے ہیں۔ پھر اسلامی دنیا کے مغربی علاقوں میں اس کے

داخل ہونے اور پھیلنے کا حال لکھتے ہیں کہ کس طرح وہ مصر اور اس سے متصل شمالی افریقہ کے ملکوں میں پھیل کر چھا گیا یہاں تک کہ اندلس اور اس سے متصل بحر روم کے جزائر تک پہنچ گیا۔ پھر مشرق میں اس کے پھیلاؤ کا سراغ لگاتے ہیں جہاں وہ "رے" میں داخل ہوا۔ پھر ہندوستان پہنچا۔ الی آخرہ۔

وہ خاص طور پر مصر میں مالکی مذہب کے پھیلنے کا حال ذرا زیادہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ سب سے پہلے کب مصر میں داخل ہوا اور اس کو کس نے داخل کیا۔ اس سلسلہ میں مختلف روایات کا ذکر کرتے ہیں اور ان میں موازنہ کرکے تطبیق دیتے ہیں۔ پھر وہ عصر حاضر میں اس کا حال بیان کرتے ہیں کہ شمالی افریقہ (تونس) میں پہلے حنفی مذہب کا غلبہ تھا لیکن بعد میں مالکی مذہب غالب آگیا۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ اندلس میں سب سے پہلے مذہب "اوزاعی" داخل ہوا اور پورے ملک پر چھا گیا۔ پھر وہاں مالکی مذہب کو امویوں نے رائج کیا اور سنہ ۲۰۰ھ کے لگ بھگ مذہب اوزاعی وہاں سے مٹ گیا۔

وہ بیان کرتے ہیں کہ اندلس میں مالکی مذہب کو وہاں کے اموی سلطان نے جبراً رائج کیا تھا کیونکہ امام مالکؒ نے اس اموی سلطان کی تعریف و توصیف کی تھی۔ اور حرم مدینہ کے حاکم پر اس کو ترجیح اور فضیلت دی تھی۔ انہوں نے اندلس کے ایک محدث سے کہا تھا کہ "ہم اللہ تعالے سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے حرم کو تمہارے بادشاہ سے زینت بخشے۔"

علامہ احمد تیمورؒ اسی طرح مالکی مذہب کے پھیلاؤ کا ذکر کرتے چلے جاتے ہیں اور ہر اُس شہر اور ملک کا ذکر کرتے ہیں جہاں اس نے رواج پایا۔

بقیہ دو مذاہب یعنی شافعی اور حنبلی جن جن علاقوں میں پھیلے اُن کا بیان بھی
علامہ احمد تیمورؒ اسی طرز پر کرتے ہیں جیسے حنفی اور مالکی مذاہب کے فروغ
پانے کا ذکر کرتے ہیں، جن کی چند مثالیں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

اس قابلِ قدر کتاب میں تین باتیں آپ کو خاص طور پر نظر آئیں گی:

اوّل یہ کہ مصنف نے کسی امام کی سوانح حیات تفصیلی طور پر بیان نہیں کی،
اور نہ اس کے اصولِ فقہ سے بحث کی ہے کہ جس سے معلوم ہو سکے کہ اس کی
فقہی آراء کن اصولوں پر مبنی ہیں۔ دراصل ان دونوں امور کا بیان ان کا مقصود
نہیں ہے، کیونکہ ان کی فقہ اور اصولِ فقہ سے بحث کرنا ایک فقہی کا کام ہے
جو فقہاء کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کی تعلیم دیں، اس کے مبادی و
اصول بیان کریں اور دیگر فقہوں سے اس کا موازنہ کریں۔ رہی دوسری بات
یعنی ائمہ کی سوانح حیات سو وہ ان کی کتبِ مناقب میں موجود ہیں، لہٰذا جو چیز
تفصیلی طور پر یکجا میسر ہے اس کو پھر دُہرانا مصنف کے لئے مناسب نہیں
تھا۔ لہٰذا ان کی ساری توجہ اس موضوع پر مرکوز رہی جس کا مواد متفرق کتابوں
میں بکھرا ہوا تھا اور ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ اس زمانہ میں کوئی کتاب ایسی
نہیں ملتی تھی جس میں فقہی مذاہب کے بارے میں یہ بکھری ہوئی معلومات
یکجا مل جائے کہ ان مذاہب کے مخصوص علاقے کون کون سے ہیں، کس
سرزمین پر وہ زیادہ پھیلے اور کہاں کہاں ان کو کم پذیرائی حاصل ہوئی۔ بالآخر
استاذ احمد تیمورؒ نے اس خلا کو پُر کیا۔ یہ ان کا بڑا قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔

دوسری بات آپ یہ دیکھیں گے کہ کسی فقہی مذہب کو کسی ملک یا شہر میں
مستقل طور پر پورا غلبہ حاصل نہیں ہو سکا بلکہ ضرور کوئی دوسرا مذہب وقتاً
فوقتاً اس سے مقابلہ کرتا رہا، یا کبھی اس کے غلبہ کے دوران ایک پُرامن حلیف

کے طور پر اس کے ساتھ موجود رہا۔ اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے
ایک مذہب کا ذکر متعدد ممالک میں کیا ہے، جبکہ کسی اور مذہب کا ذکر بھی ان
ممالک میں کیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں سے کوئی ایک مذہب کسی خاص ملک
میں اکثریت میں ہوگا تو دوسرا اقلیت میں۔

تیسری بات جو آپ اس وقیع کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے، وہ اقتباسات
کی کثرت ہے۔ یعنی مصنف نے اکثر جگہ اپنے ماخذوں کے اصل الفاظ نقل
کئے ہیں۔ یہ بات دراصل فاضل مصنف کی پختگی اور قابلِ اعتماد ہونے کی
دلیل ہے کہ وہ خود اپنے ماخذوں کے الفاظ میں اپنی بات قارئین تک پہنچا
رہا ہے تاکہ قاری براہِ راست اس ماخذ کے الفاظ سے واقف ہو اور اس کو
یقین ہو جائے کہ مصنف نے جو بات نقل کی ہے وہ صحیح اور سچی ہے۔ اس
کا ایک مقصد یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلاف کا علم ہمیں اس طرح منتقل
کیا جائے کہ وہ ہمارے ذہن کو مخاطب کرے کیونکہ اکثر اسلاف کا کلام
حکمت کی کان ہوتا ہے۔

ہمارے قدیم زمانہ کے مصنفین کی تحریر و تصنیف میں یہی خصوصیت تھی
جو ان کی عبقریت شمار ہوتی تھی، یعنی وہ قدیم کتب سے اقتباسات کو اس
طرح منتخب کر کے باہم مرتب کرتے تھے کہ نہ ان میں کوئی جھول نظر آتا
تھا اور نہ کوئی تضاد پیدا ہوتا تھا۔ ان کی پوری عبارت میں کوئی جملہ ایسا
نظر نہیں آتا تھا جو انمل بے جوڑ ہو، یا دو جملوں میں کوئی تنافر یا بیگانگی
پائی جاتی ہو۔ بلکہ پوری عبارت ایک سانچے میں ڈھلی ہوئی اور رواں
ہوتی تھی۔

یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کہ ہر شخص انجام دے سکے، بلکہ ایک

ماہر اور تجربہ کار شخص ہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ماہر آثارِ قدیمہ کھنڈرات کے علاقہ میں ایک منہدم دیوار کے پاس آئے جس کے پتھر ٹوٹ کر ہر طرف بکھر گئے ہوں۔ وہ ماہر اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کرے اور ان کو باہم جوڑ کر ایسا برتن طشت وغیرہ بنا لے جو اس کے زمانہ میں رائج برتنوں جیسا ہو۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس نے یہ برتن ایسے ٹکڑوں کو ملا کر بنایا ہے جن میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی لیکن اب اس نے ان کو ہم آہنگ کر لیا۔

نکتہ کی بات یہ ہے کہ علمی تحریر و تصنیف عام انشاء پردازی کی طرح نہیں ہوتی کہ حسین الفاظ استعمال کر کے یا خوبصورت جملے گھڑ کر کام چلا لیا جائے، بلکہ علمی تحریر و تصنیف کے لئے ضروری ہے کہ الفاظ و معانی میں مکمل ہم آہنگی ہو اور بکھرے ہوئے حقائق کو اس طرح سمیٹ کر یکجا کیا جائے کہ وہ اپنی ذات میں ایک مستقل وجود نظر آئیں۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اب تک ایسے دو عظیم مصنف نہیں دیکھے جو اس قسم کی تصنیفی مہارت میں باہم ایسی مشابہت رکھتے ہوں جیسی استاذ احمد تیمورؒ اور ان کے دوست عظیم فقیہ استاذ احمد ابراہیمؒ میں پائی جاتی تھی۔

بعض لوگ جو تحریر و تصنیف میں ابھی محض طفلِ مکتب ہیں وہ اس کو بہت معمولی کام سمجھتے ہیں اور حقارت آمیز انداز میں کہتے ہیں: "اس کتاب سے زبس اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کے مصنف کے پاس ایک بڑی لائبریری ہے جس کا اس نے فائدہ اٹھایا"۔

یہ جملہ میں نے اپنی جامعہ کے ایک استاد سے سنا تھا جو اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے نوازے۔ ان کی طرح

اور بہت سے لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں کیونکہ وہ تحریر و تصنیف کو محض عبارتوں کی بھرمار، اقوال کی تکرار، دوسروں کے الفاظ میں تغیر اور جملوں میں تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بے شک استاذ احمد تیمور مرحوم نے اپنی کتاب کو متعدد فنون کی کتابوں میں بکھرے ہوئے مواد سے جمع کر کے لکھا ہے۔ یہ کتابیں مختلف فنون سے تعلق رکھتی تھیں، مثلاً عام تاریخ، جغرافیہ اور معاجم البلدان، تراجم علماء، مناقبِ ائمہ، سفرنامے وغیرہ۔ بعض اوقات آپ دیکھیں گے کہ اس کے ایک صفحہ پر پانچ ماخذ کا ذکر ہے حالانکہ یہ صفحہ سولہ سطر سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کتاب کے کسی صفحہ پر دو ماخذ سے کم ماخذوں کا ذکر نہیں ہے۔

جب بھی ان ماخذوں کے بیانات میں تعارض ہوتا ہے تو وہ ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ ہمیشہ اپنے قول کو اس کے ماخذ کی طرف منسوب نہ کرتے تو یہ گمان بھی نہ ہوتا کہ اس میں اکثر اقتباسات ہیں جو باہم جوڑ لئے گئے ہیں۔

میں نے ایک بار سوچا کہ گن کر دیکھوں کہ انہوں نے اپنی کتاب لکھنے میں کتنی کتابوں سے مدد لی ہے تو وہ سو کے قریب نکلیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو محنت و مشقت انہوں نے اس "حجم میں چھوٹی اور فائدہ میں بڑی" کتاب کی تیاری میں اٹھائی ہے اس کی میرے دل میں بڑی قدر و منزلت ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے ایک علمی خلا کو پُر کیا جو ان سے پہلے کوئی نہ کر سکا تھا۔ ان کے بعد مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو ان کے ساتھ کاندھا ملا کر چل سکتا ہو یا جو راہ انہوں نے نکالی تھی کم از کم اسی پر گامزن ہو سکتا ہو۔

ایسا ہی علمی خلا دیگر چار مذاہب کی تاریخ میں بھی موجود ہے جس کو پُر کرنے کی ضرورت ہے، یعنی مذہبِ زیدی، مذہبِ امامیہ (اثنا عشری) مذہبِ ظاہری اور مذہب اباضی کے ظہور اور فروغ پانے کے سلسلہ میں۔

ہم نے اپنی کتابوں میں ان میں سے بعض مذاہب کے بارے میں تھوڑا بہت لکھا ہے، لیکن وہ اس سے بہت کم ہے جو عالم جلیل احمد تیمور پاشا نے اپنی اس کتاب میں بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو، اسلامی خدمات کے سلسلہ میں ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور بعد میں آنے والوں کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ ان کے چھوڑے ہوئے علمی اثاثہ سے مستفید ہوں۔ إِنَّهُ سَمِيعٌ مُجِيبٌ۔

محمد ابوزہرہ

اسلامی دنیا میں

فقہی مذاہب اربعہ کا فروغ

(ایک تاریخی جائزہ)

از قلم

علامہ احمد تیمور پاشا

تمہید

زیرِ عنوان فقہی مذاہب سے ہماری مراد یہ چار مذاہب ہیں :
حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی کہ انہی کی فقہ پر آج مسلمانوں کی اکثریت عمل پیرا ہے، اور انہی چار سُنّی مذاہب کو دیگر سُنّی مذاہب کے مقابلہ میں بقا اور غلبہ حاصل ہوا۔ دیگر سُنّی مذاہب سے ہماری مراد ہے : مذہبِ سفیان ثوریؒ (کوفہ میں)، مذہبِ حسن بصریؒ (بصرہ میں)، مذہبِ اوزاعیؒ (شام اور اندلس وغیرہ میں)، مذہبِ ابن جریر طبریؒ (بغداد میں)، مذہبِ ابو ثورؒ (بغداد میں)، اور مذہبِ داؤد ظاہری (متعدد بلاد میں)، نیز ان کے علاوہ دیگر فقہاء الامصار کے مذاہب (جو بالآخر فنا ہو گئے)۔

ان مذاہب کے ظہور سے پہلے عہد صحابہ کرامؓ میں اصحابِ قراء کے فتووں پر عمل ہوتا تھا کہ اس زمانہ میں وہی کتاب اللہ کا علم رکھتے تھے اور اس کی دلالتوں سے واقف تھے [1]۔

جب صحابہ کرامؓ کا دور ختم ہوا تو تابعینؒ ان کے جانشین بنے۔ یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے فقہی مسائل میں ان صحابہ کرامؓ کو اپنا پیشوا و مقتدا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۴۴۶

بتایا جو ان کے شہروں میں قیام پذیر تھے۔ وہ صرف چند جزئی مسائل میں ہی ان کے سوا دوسروں کی پیروی کرتے تھے۔ چنانچہ اہلِ مدینہ اکثر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے فتاویٰ پر عمل کرتے تھے، اور اہلِ کوفہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتووں پر عمل پیرا تھے، اہلِ مکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتاویٰ پر کاربند تھے، اور اہلِ مصر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے فتاویٰ کا اتباع کرتے تھے[٣٢]۔

تابعین کے بعد فقہائے امصار کا دور آیا جن میں امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور دوسرے فقہاء شامل ہیں جن کا تفصیلی ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس دور میں اکثر یہی فقہائے امصار اپنے اپنے شہروں کے پیشوا اور امام تھے، وہاں کے لوگ فقہی مسائل میں انہی سے رجوع کیا کرتے تھے اور اکثر انہی کے فتاویٰ کو مانتے تھے۔

پھر کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ان میں سے بعض فقہاء کے مذاہب کی اشاعت دوسرے شہروں میں بھی ہونے لگی، اور بعض فقہاء کا مذہب نابود ہونے لگا۔ مثلاً امام سفیان ثوریؒ (متوفیٰ ١٦١ھ) اور امام حسن بصریؒ (متوفیٰ ١١٠ھ) کے مذہب تو اپنے متبعین کی تعداد کم ہونے کے باعث بہت جلد متروک ہو گئے۔ اور امام اوزاعیؒ (متوفیٰ ١٥٧ھ) کا مذہب دوسری صدی ہجری کے بعد فنا ہو گیا۔ اسی طرح مذہب ابوثورؒ (متوفیٰ ٢٤٠ھ) تیسری صدی کے بعد اور مذہب ابن جریر (متوفیٰ ٣٠٢ھ) چوتھی صدی کے بعد ختم ہو گیا[٣٣]۔

لیکن ان قلیل العمر مذاہب سے داؤد ظاہری (متوفیٰ ٢٧٠ھ) کا

---

٣٢ خطط المقریزی ج ٢۔ ص ٣٣٢۔ الدیباج المذہب ص ١٢۔

٣٣ ایضاً۔

مذہب مستثنیٰ ہے کہ یہ ایک طویل مدت تک قائم رہا اور اس تمام عرصہ میں وہ مذاہبِ اربعہ سے مقابلہ کرتا رہا۔ چنانچہ مقدسی نے "احسن التقاسیم" میں اپنے زمانہ یعنی چوتھی صدی ہجری کے فقہی مذاہب کا حال بیان کرتے ہوئے مذہب حنبلی کی بجائے مذہبِ ظاہری ہی کو (سوادِ اعظم کا) چوتھا مذہب بیان کیا ہے، اور حنابلہ کو اصحابِ حدیث کے زمرہ میں شمار کیا ہے[٣٤]۔ لیکن ابن فرحون نے "الدیباج المذہب" میں اپنے زمانہ یعنی آٹھویں صدی میں رائج فقہی مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے مذہبِ ظاہری کو (اہلِ سنت کا) پانچواں مذہب شمار کیا ہے[٣٥]۔ پھر اس کے بعد یہ مذہب بھی فنا ہو گیا اور صرف مذکورہ بالا چار مذاہب باقی رہ گئے۔ البتہ بعض مسلمان فرقوں کے چند مخصوص مذاہب بھی باقی و قائم رہے، لیکن جمہور مسلمان ان مذاہب کو اہلِ سنت میں شمار نہیں کرتے، لہٰذا ہم بھی یہاں ان کا ذکر نہیں کریں گے، اور صرف انہی چار مذاہب کے حالات بیان کرنے پر اکتفا کریں گے (جو سنی کہلاتے ہیں)۔

ابن خلدون (م ٨٠٨ھ) کہتا ہے:

"مذہبِ ظاہری کا تو یہ حشر ہوا کہ ان کے ائمہ کے ختم ہوتے ہی یہ مذہب صفحۂ ہستی سے ایسا مٹا کہ اب تک اس میں کوئی جان نہیں پڑی۔ جب سے جمہور (مسلمین) نے اس کے ماننے

---

٣٤ احسن التقاسیم للمقدسی (طبع لیدن ١٩٠٦ء)، ص ٣٧۔ (مترجم کہتا ہے کہ مقدسی نے یہاں ان چار مذاہب کو اہلِ حدیث کے زمرہ میں شمار کیا ہے: مذہب حنبلی، مذہب راہویہ، مذہب اوزاعی اور مذہب منذری۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ مقدسی بذاتِ خود حنفی مسلک کا پیرو تھا۔ دیکھئے احسن التقاسیم کا جدید ایڈیشن، طبع بیروت ١٩٨٧ء، ص ٣٣)۔ مصری محمد۔

٣٥ الدیباج المذہب

والوں پر نکیر کی ہے اور اس کو اپنے زمرہ سے نکالا ہے اب اس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہا۔ یہ محض کتابوں میں لکھا پڑا ہے اب اگر کوئی طالب علم ان کی کتابوں سے ان کی فقہ اور ان کا مذہب سیکھنے بیٹھتا ہے تو وہ حقیقت میں وقت کو رائیگاں کرتا ہے اور جمہورِ اُمّت کی مخالفت مول لیتا ہے۔

.... اس کے بعد اُمّت میں دو ہی مذہب رواج پذیر رہ گئے۔ یا تو اہلِ رائے کا مذہب (حنفی) عراق میں یا اہلِ حدیث کا مذہب (مالکی) حجاز میں..... پھر حضرت امام مالکؒ کے بعد امام شافعیؒ نے آپ کی جگہ لی.... اور اہلِ عراق و اہلِ حجاز کے مسلکوں کو ملا کر اپنا ایک جداگانہ مسلک بنایا.... پھر امام احمد بن حنبلؒ کا دور آیا.... اور ان کے بعد تمام شہروں میں تقلید کا دائرہ انہیں چار مذاہب میں محصور و محدود ہو گیا اور دوسرے مذاہب کے مقلد مٹ مٹا گئے.... اب سارے ممالکِ اسلامیہ میں انہیں مذاہبِ اربعہ کا چلن ہے[6]")!

---

[6] مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۴۶ ــ ۴۴۷۔

مذہب حنفی

مذہبِ اہل الرائے:

مذہبِ حنفی مذاہبِ اربعہ میں سب سے قدیم ہے۔ اس کے امام، امامِ اعظم ابوحنیفہ النعمان کوفی رضی اللہ عنہ ہیں جو سنہ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور صحیح روایت کے مطابق سنہ ۱۵۰ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

اس مذہب کی نشوونما امام صاحبؒ کے وطن کوفہ میں ہوئی اور پھر وہ عراق کے تمام شہروں میں پھیل گیا۔

اصحابِ امام ابوحنیفہؒ "اہل الرائے" کہلاتے ہیں کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ عراق میں حدیثیں نسبتاً کم پہنچیں، لہٰذا انہوں نے (فقہی مسائل استنباط کرنے کے لئے) قیاس سے بہت کام لیا اور اسی وجہ سے وہ قیاس کرنے میں ماہر ہو گئے۔ ان کے امام کا علمِ فقہ میں بہت بلند مقام ہے۔ اس کی شہادت خود ان کے ہم مقابل امام شافعیؒ اور امام مالکؒ نے دی ہے[1]۔

طبقاتِ حنفیہ کے مؤلفین کا بیان ہے کہ مذہبِ حنفی دور دراز ممالک کے اکثر شہروں میں پھیل گیا، مثلاً بغداد کے نواح میں، مصر، فارس، روم (ترکی)، بلخ و بخارا اور فرغانہ میں۔ نیز ہندوستان کے اکثر شہروں میں اور

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۴۷

ملک یمن وغیرہ کے بعض شہروں میں یہ عام ہو گیا۔[۵۲]

فیروز آبادی کی "المرقاۃ الوفیہ فی طبقات الحنفیہ" میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے وہ اصحاب جنہوں نے فقہ حنفی کو مدوّن کیا ہے چالیس ہیں۔ انہیں میں سے امام ابو یوسفؒ اور امام زفرؒ بھی ہیں۔[۵۳]

اسی کتاب میں مذکور ہے کہ "اسد بن عمرو سب سے پہلے فقیہ ہیں جنہوں نے فقہ حنفی میں کتابیں لکھیں"۔ اور اسی کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ "نوح بن ابی مریم "جامع" کے لقب سے مشہور ہوئے کیونکہ ایک قول کے مطابق سب سے پہلے انہوں نے فقہ حنفی کو (کتابوں میں) جمع کیا"۔ لیکن ان کے اس لقب کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ مختلف علوم کے جامع تھے۔

عہدۂ قضا پر احناف کا تقرر

پھر جب خلیفہ ہارون الرشید مسندِ خلافت پر متمکن ہوا اور اس نے ۱۷۰ھ کے بعد امام ابو یوسفؒ صاحبِ امام ابو حنیفہؒ کو قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز کیا تو تمام قلمرو میں قضاۃ کے تقرر کا اختیار ان کے ہاتھ میں آگیا چنانچہ تمام بلاد عراق و خراسان، اور شام و مصر، بلکہ شمالی افریقیہ کے دور دراز مقامات تک میں قضاۃ کا تقرر انہی کے حکم سے ہوتا تھا اور اس عہدہ پر وہ صرف اپنے اصحاب اور فقہائے احناف ہی کو فائز کرتے تھے۔[۵۴] لہٰذا خلافتِ عباسیہ کی قلمرو کے تمام مسلمان باشندے فقہائے احناف کے احکام و

---

[۵۲] الفوائد البھیہ ص ۶۔

[۵۳] المرقاۃ الوفیۃ للفیروز آبادی ص ۱۲۱۔

[۵۴] مقریزی: "الخطط" ج ۲ ص ۳۳۳۔

فتاویٰ پر عمل کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس طرح یہ مذہب ان ممالک میں خوب پھیلا، بالکل اسی طرح جیسے اندلس میں یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر کے ذریعہ حکومت کی سرپرستی میں مذہب مالکی پھیلا۔ اسی وجہ سے ابن حزم کہتے ہیں کہ "دو مذہب ایسے ہیں جو اپنے آغاز ہی سے حکومت و اقتدار کے ذریعہ دنیا میں پھیلے ہیں، مذہبِ حنفی مشرق میں، اور مذہبِ مالکی اندلس میں۔"[۵۵]

خلافتِ عباسیہ میں عہدۂ قضا پر حنفیوں کے فائز ہونے کی وجہ سے یہ مذہب ان مذکورہ بالا ممالک میں سب مذاہب پر غالب رہا۔ لیکن پھر حالات نے پلٹا کھایا اور بقیہ تین مذاہب سے اس کی کشمکش شروع ہو گئی، جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

عہدۂ قضا کو صرف حنفی فقہاء کے لئے مخصوص رکھنے میں احناف اس قدر کوشاں تھے کہ ایک مرتبہ عباسی خلیفہ قادر باللہ (متوفی ۴۲۲ھ) نے ۳۹۳ھ میں شافعی فقیہ ابو حامد اسفرائینی (متوفی ۴۰۶ھ) کے مشورہ پر عمل کر کے بغداد کے قاضی ابو محمد بن الکفانی حنفی کو معزول کر کے ان کی مرضی کے خلاف ابو العباس احمد بن محمد البارزی الشافعی کو اس منصب پر فائز کر دیا۔ ادھر ابو حامد اسفرائینی نے سلطان محمود غزنوی اور اہلِ خراسان[۵۶] کو لکھ بھیجا کہ "خلیفہ نے قضا کا منصب احناف سے لے کر شافعیوں کے سپرد کر دیا ہے۔" اس واقعہ کی خبر جب بغداد میں پھیلی تو اہلِ بغداد دو گروہوں میں بٹ گئے اور ان میں جھگڑے فساد شروع ہو گئے۔

---

[۵۵] نفح الطیب ج ۱ ص ۲۳۳۔ بغیۃ الملتمس۔ ص ۴۹۷

[۵۶] واضح رہے کہ سلطان محمود غزنوی اور اہلِ خراسان حنفی مسلک کے پیرو اور حامی تھے ۱۲ (مترجم)

بالآخر خلیفہ نے مجبور ہو کر معززینِ شہر اور قضاۃ کو جمع کیا اور اپنی صفائی میں ان کے آگے ایک بیان پڑھا جس میں لکھا تھا کہ ابو حامد اسفرائینی نے مکارانہ انداز میں اپنے آپ کو امیر المومنین کا خیر خواہ، مشفق اور امین ظاہر کر کے غلط مشورے دیئے اور عہدۂ قضاء کے معاملہ میں مکر و فریب اور خیانت سے کام لے کر بارزی کو منصبِ قضاء پر مقرر کرا دیا۔ لیکن جب امیر المومنین کو حقیقتِ حال کا علم ہوا اور ان پر واضح ہوا کہ بارزی کو قاضی بنانے کا مشورہ دینے میں اسفرائینی کی کیا بد نیتی تھی اور وہ کیا فتنہ و فساد پھیلانا چاہتا تھا، وہ دراصل امیر المومنین کو ان کے اسلاف اور پیشرو خلفاء کے طریقہ سے ہٹانا چاہتا تھا جو ہمیشہ احناف کو منصبِ قضاء پر فائز کیا کرتے تھے۔ تو اسفرائینی کا یہ مکر و فریب واضح ہونے کے بعد امیر المومنین نے بارزی (شافعی) کو فوراً معزول کر دیا اور یہ عہدہ اس کے اصل حقدار کے سپرد کر دیا اور قدیم طریقہ کو پھر رائج کر دیا اور علمائے احناف کو جو عزت و احترام اور اعزاز و اکرام پہلے حاصل تھا اس کو بحال کر دیا۔" اس بیان کے ساتھ ساتھ خلیفہ نے یہ بھی اعلان کرا دیا کہ "ابو حامد اسفرائینی سے کوئی شخص نہ ملے، نہ اس کے حقوق ادا کئے جائیں اور نہ اس کے سلام کا جواب دیا جائے۔" اس کے علاوہ ابو محمد اکفانی کو عہدۂ قضاء پر بحال کر کے خلعت سے سرفراز کیا۔ بالآخر ابو حامد اسفرائینی کو اس عتاب سے مجبور ہو کر دار الخلافہ چھوڑنا پڑا اور وہ شام و مصر کی طرف چلے گئے۔[۷۷]

---

[۷۷] مقریزی، الخطط ج ۲۔ ص ۳۳۲-۳۳۳۔

مذہبِ حنفی (شمالی) افریقیہ[عہ] اور سسلی میں:

(شمالی) افریقیہ میں مذہب حنفی کے آنے سے پیشتر کوئی مخصوص فقہ رائج نہیں تھی بلکہ سنن و آثار پر عمل ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ (سب سے پہلے) عبداللہ بن فروخ ابو محمد الفاسی حنفی مذہب لے کر (شمالی) افریقیہ میں آئے۔ پھر جب اسد بن الفرات بن سنان اس علاقہ (افریقیہ) کے قاضی مقرر ہوئے تو یہ مذہب وہاں غالب ہو گیا اور اکثر لوگ اس کے پیرو ہو گئے۔[۷۸] پھر یہ مذہب معز بن بادیس (متوفی سنہ ۴۵۴ھ) کے آنے تک وہاں اسی طرح غالب رہا۔ پھر معز بن بادیس نے وہاں اقتدار حاصل کیا تو وہاں کے باشندوں کو مالکی مذہب کا پیرو بنایا۔[۷۹] چنانچہ آج بھی یہ وہاں کی اکثریت کا مذہب ہے اور بہت

عہ یہاں اور آگے پوری کتاب میں لفظ "افریقیہ" اکثر جگہ آیا ہے۔ ہم نے تھوڑی وضاحت کے لئے "شمالی" کا اضافہ کر دیا ہے۔ دراصل اس سے شمالی افریقیہ کا وہ علاقہ مراد ہے جو طرابلس (لیبیا)، تونس اور الجزائر پر مشتمل ہے۔ بعض نے اس سے کم علاقہ مراد لیا ہے اور بعض نے زیادہ۔

[۷۸] مقریزی، خطط ج ۲۔ ص ۲۔

"معالم الایمان (جلد ۱، ص ۱۰۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن فروخ نے امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ دونوں سے علم حاصل کیا۔ اگرچہ ان کا استاد امام مالکؒ پر تھا لیکن اگر اہلِ عراق کا کوئی قول ان کو صحیح نظر آتا تھا تو وہ اس کی طرف مائل ہو جاتے تھے۔ اور ابن الفرات نے امام مالکؒ اور اصحاب امام ابو حنیفہؒ سے علم حاصل کیا۔ انہوں نے شمالی افریقیہ میں اہلِ عراق کے مذہب کی اشاعت ایک خاص وجہ سے کی تھی۔ معالم الایمان کے مصنف نے اس خاص وجہ کا تذکرہ نہیں کیا۔ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے کہ ابن الفرات نے پہلے اصحاب ابو حنیفہؒ سے درس لیا پھر امام مالکؒ کا مذہب اختیار کر لیا۔ (مقدمہ ص ۴۵۰)۔ (مصنف)

[۷۹] الکامل لابن اثیر ج ۹ ص ۹۵۔ معز نے ۴۰۷ھ میں اقتدار حاصل کیا اور ۴۵۴ھ میں وفات پائی۔

تھوڑے سے لوگ حنفی مذہب کے مقلد پائے جاتے ہیں۔[۱۰]

ابن فرحون کی "دیباج" میں ہے کہ سنہ [illegible]ھ کے قریبی زمانہ تک حنفی مذہب نے (شمالی) افریقیہ میں خوب فروغ پایا۔[۱۱] لیکن پھر یہ تنزل پذیر ہو گیا۔ اس سے پہلے یہ مذہب تھوڑا بہت اس علاقہ کے مغربی جانب اندلس اور شہر "فاس" میں بھی داخل ہوا تھا۔

مقدسی کی "احسن التقاسیم" میں ہے کہ صقلیہ (سسلی) کے باشندے سب حنفی ہیں۔[۱۲] (یعنی چوتھی صدی ہجری میں)۔

مقدسی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے بعض اہل مغرب (مراکش وغیرہ) سے پوچھا کہ "امام ابوحنیفہؒ" کا مذہب تمہارے پاس کیسے پہنچا جبکہ یہ تمہارے راستہ پر نہیں پڑتا؟" انہوں نے کہا کہ "ہمارے ہاں کے ایک عالم وہب بن وہب، امام مالکؒ کے ہاں سے علم فقہ اور دیگر علوم حاصل کر کے آئے تو اسد بن عبداللہ نے اپنی جلالت شان اور کبر نفس کی وجہ سے اس میں عار محسوس کی کہ وہ وہب بن وہب سے ان علوم کا درس لیں، لہٰذا براہ راست امام مالکؒ سے علم حاصل کرنے کے لئے وہ مدینہ گئے، لیکن اس زمانہ میں امام مالکؒ شدید علیل تھے۔ اسد ان کے صحت مند ہونے کا انتظار کرنے لگے، جب بہت عرصہ گزر گیا اور امام مالکؒ اسی طرح علیل رہے تو خود امام مالکؒ نے ان سے کہا کہ "تم واپس (اپنے وطن) وہب کے پاس چلے جاؤ (اور اس سے علم حاصل کر لو) کیونکہ میں نے اپنا تمام علم اس کو ودیعت کر دیا ہے،

---

[۱۰] معالم الایمان ج ۲ ص ۳ و ص ۱۰۔ نیز صفوۃ الاعتبار ج ۲ ص ۱۱۵۔

[۱۱] الدیباج المذہب ج ۲۔ ص ۱۷-۱۸۔

[۱۲] احسن التقاسیم ص ۲۲۷-۲۳۶۔

اور اس طرح تم لوگوں کو سفر کی زحمتوں سے بچا لیا ہے۔" یہ بات اسد کو اور بھی شاق گزری، اور وہاں سے مایوس ہو کر انہوں نے لوگوں سے ایسے عالم کی بابت دریافت کیا جو امام مالکؒ کے درجہ کا ہو۔ لوگوں نے کہا "کوفہ میں ایک نوجوان ہے محمد بن الحسن جو امام ابوحنیفہؒ کا شاگرد ہے۔"

چنانچہ وہ کوفہ گئے اور امام محمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام محمدؒ نے بھی بڑی گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا اور ان میں فہم و ذکاوت کے آثار اور طلب علم کا شوق دیکھا تو بڑی محنت اور توجہ کے ساتھ ان کو فقہ کی تعلیم دی۔

انہوں نے جب دیکھا کہ اسد کی علمی استعداد قابل اطمینان حد تک پوری ہو گئی تو ان کو مغرب کی طرف روانہ کر دیا۔ جب وہ علم سے آراستہ ہو کر اپنے وطن پہنچے اور وہاں نوجوانوں کو درس دینا شروع کیا تو لوگ فقہی فروعات میں ان کی مہارت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ علم فقہ میں ان کی نکتہ سنجیوں نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا، انہوں نے ایسے ایسے فروعی مسائل بیان کئے جو ابن وہب نے کبھی سنے بھی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر تعداد میں لوگ ان کے درس میں شامل ہونے لگے۔ اور انہی شاگردوں کے ذریعہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب پورے مغرب میں پھیل گیا۔

اس کے بعد مقدسی کہتا ہے کہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ پھر اندلس میں یہ مذہب کیوں نہیں پھیلا؟

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ اندلس میں بھی اس مذہب کو کچھ کم فروغ حاصل نہیں ہوا۔ لیکن ایک روز اتفاق ایسا ہوا کہ سلطان اندلس کے سامنے حنفیوں اور مالکیوں کے مابین مناظرہ ہو رہا تھا کہ اس

دوران سلطان نے پوچھا کہ "امام ابو حنیفہ کہاں کے تھے؟" جواب ملا کہ "کوفہ کے"۔ سلطان نے پھر پوچھا "اور امام مالک کہاں کے تھے؟" لوگوں نے کہا کہ "مدینہ کے"۔ اس پر سلطان نے فیصلہ دیا کہ "دارالہجرت (مدینہ) کے عالم ہمارے لئے کافی ہیں"۔ پھر علمائے احناف کو دربار سے اُٹھ جانے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ "میں اپنی قلمرو میں بیک وقت دو (فقہی) مذہبوں کا رائج رہنا پسند نہیں کرتا۔"

مقدسی کہتا ہے کہ "میں نے یہ واقعات اندلس کے متعدد بزرگوں سے بھی سُنے ہیں۔"[۱۳]

ہم کہتے ہیں کہ یہ واقعات غور طلب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ وہب بن وہب ایک مجہول شخصیت ہے۔ اس نام کے کسی شخص کا ذکر امام مالکؒ کے تلامذہ میں نہیں آتا۔ البتہ عبداللہ بن وہب نام کے ایک شخص ان کے شاگرد گزرے ہیں، لیکن وہ مغرب کی طرف کبھی نہیں گئے، وہ مصر میں رہے اور وہیں وفات پائی۔

دوسرے یہ کہ اسد بن عبداللہ کہنا درست نہیں ہے، بلکہ صحیح نام ابوعبداللہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد ہیں ابوعبداللہ اسد بن الفراتؒ، جو امام محمد بن الحسن شیبانیؒ سے ملے تھے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب سے فقہ حنفی کی تعلیم حاصل کر کے (شمالی) افریقیہ گئے اور وہاں حنفی مذہب کو رواج دیا۔ لیکن اس مذکورہ روایت میں یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ پہلے امام مالکؒ کے پاس گئے اور انہیں بیمار پایا۔ پھر امام مالکؒ نے ان کو وہب بن وہب کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ بیشک

---

[۱۳] احسن التقاسیم۔ ص ۲۳۶-۲۳۷

امام محمدؒ کے پاس جانے سے قبل مدینہ امام مالکؒ کے پاس گئے اور ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جب وہ امام مالکؒ سے تحصیل علم کر چکے تو مزید علم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر امام مالکؒ نے ان سے فرمایا! "اب تم لوگوں کے لئے کافی ہو" یا یہ فرمایا کہ "اے مغربی! اب تک جو علم تم حاصل کر چکے ہو وہ تمہارے لئے کافی ہے۔ لیکن اگر تم رائے اور قیاس کا علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو عراق جاؤ۔"[۱۴]

---

[۱۴] مترجم کہتا ہے کہ قاضی ابوعبداللہ اسد بن فراتؒ دراصل فقہ حنفی اور فقہ مالکی دونوں کے ممتاز عالم تھے۔ وہ عبادات میں فقہ مالکی کا اتباع کرتے تھے اور معاملات کا عموماً فقہ حنفی کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ ان کا آبائی وطن نیشاپور تھا ۱۴۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قیروان اور تونس میں رہے۔ وہیں اسد بن فرات کی ابتدائی تعلیم ہوئی اور وہیں محدث علی بن زیاد سے پہلی مرتبہ موطا امام مالکؒ پڑھی۔ پھر ۱۷۲ھ میں امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور پھر عراق میں امام ابویوسفؒ (م ۱۸۲ھ) اور امام محمد بن حسنؒ (م ۱۸۹ھ) سے فقہ حنفی کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے مصر آئے اور مزید علم حاصل کیا خصوصاً ممتاز مالکی عالم عبدالرحمن بن قاسمؒ سے خوب استفادہ کیا۔ وہ ان سے فقہی سوالات کرتے اور جو جوابات اپنے استاد سے ملتے ان کو ترتیب سے لکھتے جاتے۔ ۶۰ جزء پر مشتمل فقہ کی یہ پہلی کتاب "الاسدیہ" کہلائی۔ پھر قاضی اسدؒ اپنے وطن قیروان چلے گئے۔ اور ۲۰۳ھ میں وہاں کے قاضی القضاۃ بنائے گئے۔ ۲۱۲ھ میں آپ کے کہنے پر بحر روم کے جزیرہ سسلی (صقلیہ) کو فتح کر کے اس کو دارالسلام بنایا گیا اور وہیں ایک معرکہ میں آپ نے ۲۱۳ھ میں جام شہادت نوش کیا۔ رضی اللہ تعالیٰ (تفصیل کے لئے دیکھئے: "معالم الایمان" للدباغ ج ۲ ص ۲-۳۔ "ترتیب المدارک" القاضی عیاض ج ۲۔ ص ۲۷)۔ معراج محمد۔

مذہبِ حنفی مصر میں:

مذہبِ حنفی کو مصر میں سب سے پہلے قاضی اسمٰعیل بن الیسع نے متعارف کرایا جبکہ وہ سنہ ۱۶۴ھ میں خلیفہ مہدی عباسی کی طرف سے مصر کے قاضی مقرر ہو کر آئے۔ وہ مصر کے سب سے پہلے حنفی قاضی ہیں[۱۵] اور سب سے پہلے وہی حنفی فقہ کو مصر میں لے کر آئے۔ ورنہ اس سے پہلے اہلِ مصر مذہب حنفی سے ناآشنا تھے۔

اسمٰعیل بن الیسع ویسے تو بہت نیک اور اچھے قاضی تھے لیکن وہ (بعض حالات میں) اوقاف کو فسخ کرنے کے حق میں تھے۔ یہ بات اہلِ مصر کو گراں گزری اور انہوں نے خلیفہ مہدی سے شکایت کی کہ "یہ ایسے نئے احکام ہم پر جاری و نافذ کر رہے ہیں جن سے ہمارے شہر والے پہلے کبھی واقف نہیں تھے" لہٰذا مہدی نے ان کو اس عہدہ سے معزول کر دیا۔[۱۶]

---

[۱۵] مقریزی: الخطط۔ ج ۲۔ ص ۳۳۳

[۱۶] المرقاۃ الوفیہ للفیروز آبادی ص ۱۳۲۶ھ۔ "رفع الاصر" لابن حجر و "قضاۃ مصر" لعلی بن عبدالقادر الطوخی۔ ص ۱۰۔

مترجم کہتا ہے کہ صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ دراصل امام ابوحنیفہؒ، قاضی شریحؒ اور امام نخعیؒ کی متابعت میں، وقف کو جائز مگر عاریت کی طرح غیر لازم قرار دیتے تھے کہ واقف کو جب اس کا جی چاہے وقف کے فسخ کر دینے کا اختیار ہے، سوائے اس صورت میں کہ اس کے جائداد موقوفہ ہونے کا قاضی فیصلہ کر دے یا واقف نے اس کے وقف ہونے کی وصیت کی ہو۔ امام ابو یوسفؒ بھی پہلے اسی کے قائل تھے مگر بعض احادیث کا علم ہونے کے بعد انہوں نے رائے بدل دی اور وقف کے لازم اور دائمی ہونے کے قائل ہو گئے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پھر اس کے بعد بھی عباسیوں کے عہدِ خلافت تک مذہبِ حنفی مصر میں برابر فروغ پاتا رہا۔ البتہ یہ ہوا کہ قاضی کا عہدہ صرف حنفیوں کے لئے مخصوص نہ رہا بلکہ کبھی اس عہدہ پر حنفی فائز ہوتے اور کبھی مالکی اور کبھی شافعی۔[۱۷]

بالآخر جب مصر پر فاطمیوں کا تسلط ہوا اور وہ اسماعیلی شیعہ مذہب کے علمبردار تھے تو انہوں نے قاضی بھی اسی مذہب کے مقرر کئے۔ اس طرح حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے یہ مذہب وہاں خوب مضبوط ہوا اور اسی کے فقہی احکام وہاں جاری ہو گئے اور تمام عدالتی فیصلے اسی کے مطابق ہونے لگے۔ البتہ سنی مذاہب کے مسائلِ عبادات میں دخل نہیں دیا جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی رعیت یعنی اہلِ سنت کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادات ادا کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ چنانچہ قلقشندی اپنی کتاب "صبح الاعشیٰ"[۱۸] میں لکھتا ہے:

"قاضی اہلِ سنت والجماعت کی تالیفِ قلب کرتے رہتے تھے۔"[۱۹]

(گزشتہ سے پیوستہ) امام محمدؒ بھی اس کے لزوم و دوام کے قائل ہیں اور جمہور علمائے احناف کا فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

لیکن قاضی اسمٰعیل بن الیسعؒ امام صاحبؒ کے قول کو اختیار کرتے تھے۔ مصر کے فقیہ لیثؒ بن سعدؒ نے اگر ان کو سمجھایا اور احادیث و آثار کے حوالے دیئے مگر انہوں نے رائے نہیں بدلی۔ بالآخر لیثؒ بن سعدؒ نے خلیفہ مہدی عباسی کو خط لکھ کر قاضی اسمٰعیل کی معزولی کا فرمان منگوا لیا اور وہ فرمان ان کو سنایا۔ قاضی اسمٰعیلؒ نے کہا: اے ابو الحارث! آپ نے تکلف کی کیا ضرورت تھی، بخدا اگر خلیفہ کی طرف سے زبانی معزولی بھی آ جاتا کہ مجھ سے کہتے کہ یہ عہدہ چھوڑ دو تو میں چھوڑ کر چلا جاتا! ابو الحارثؒ نے کہا: بے شک ہم نے تمہیں دیانت دار اور لوگوں کے سوال لینے سے مجتنب پایا ہے۔ مزید تفصیل کیلئے دیکھئے: مقالات الکوثری للشیخ محمد زاہد الکوثری (مطبوعہ ۱۳۷۳ھ) ص ۲۰۰ تا ۲۱۵ ۔ مترجم محمد۔

[۱۷] مقریزی: الخطط۔ ج ۲۔ ص ۳۳۴۔

[۱۸] صبح الاعشیٰ۔ ج ۳۔ ص ۵۲۴۔

اوران کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق مذہبی شعائر کے اظہار کی آزادی دیتے تھے، حتیٰ کہ وہ ان کو چھوٹی بڑی مساجد میں نماز تراویح ادا کرنے سے بھی نہیں روکتے تھے حالانکہ یہ ان کے عقیدہ کے خلاف ہے۔[19] ان کی حکومت میں مالکی، شافعی اور حنبلی سب اپنے اپنے مذہبی شعائر کھلے عام ادا کرتے تھے، سوائے احناف کے۔[20]

فاطمی حکمران (اوران کے قضاۃ فیصلہ اور فتوے دینے میں) مالکی مذہب کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان سے جب بھی کوئی مالکی فقہ کے مطابق فیصلہ مانگتا تھا تو وہ اس کے مطابق حکم صادر کرتے تھے۔"

ہم کہتے ہیں کہ فاطمی دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا جبکہ حکومت نے شیعہ قاضی کے ساتھ ساتھ مالکی اور شافعی قاضی بھی مقرر کئے۔ چنانچہ جب ان کے وزیر ابو علی احمد بن الافضل (فرزند امیر الجیوش) نے خلیفہ الحافظ لدین اللہ کو تاج و تخت سے محروم کر کے قید میں ڈال دیا (اور اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا) تو اپنے مذہب امامی کا اعلان کیا اور بیک وقت چار قضاۃ کا تقرر کیا۔ ان میں سے دو تو شیعہ مذہب کے تھے، ایک امامی اور دوسرا اسماعیلی۔ اور دو سُنّی مذہب کے، ایک مالکی اور دوسرا شافعی۔

---

[19] ایسا بھی ہوا ہے کہ ان کے بعض خلفاء نے تراویح پڑھنے کی ممانعت کی، اور بعض نے کسی شخص کے پاس موطا امام مالکؒ دیکھی تو اس کو سزا دی۔ لیکن ایسا شاذ ہوا ہے لہٰذا یہاں علقشندی نے ان کے دور کا وہ عمل بیان کیا ہے جو اکثر جاری تھا۔ (مصنف)

[20] اس کی وجہ فاطمیوں کی خلفائے عباسیہ سے چشمک تھی جن کا سرکاری مذہب حنفی تھا۔ اس پر مصنف نے آگے روشنی ڈالی ہے۔ (معراج محمد)

ان میں سے ہر قاضی اپنے مذہب کے مطابق مقدمات فیصل کرتا تھا اور میراث کی تقسیم بھی اسی کے مطابق کرتا تھا۔ لیکن جب ابو علی کو قتل کر دیا گیا تو نظام قضاء[21] پھر سابقہ حالت پر آ گیا، یعنی صرف ایک اسماعیلی قاضی مقرر ہونے لگا۔

ہمارے خیال میں فاطمیوں کو مذہب حنفی سے اس لئے نفرت تھی کہ یہ خلافتِ عباسیہ کا مذہب تھا، اور خلافتِ عباسیہ مشرق میں ان کی حریف تھی۔

اس کے بعد جب مصر میں ایوبی سلطنت قائم ہوئی تو اس نے مذہب تشیع کا عمل دخل وہاں ختم کر دیا، کیونکہ اس کے سلاطین شافعی المذہب تھے۔ انہوں نے وہاں جا بجا شافعی اور مالکی فقہاء کے لئے مدرسے قائم کئے۔

البتہ سلطان نور الدین شہید مذہباً حنفی تھا، لہٰذا اس کی وجہ سے تمام بلادِ شام میں حنفی مذہب رواج پا گیا اور وہیں سے احناف کثیر تعداد میں مصر آئے۔ اس کے علاوہ بلادِ شرقیہ سے بھی بہت سے حنفی فقہاء مصر پہنچے، چنانچہ ان کے لئے سلطان صلاح الدین ایوبی نے قاہرہ میں ایک مدرسہ "مدرسہ سیوفیہ" کے نام سے قائم کیا۔ الغرض اس دور میں یہ مذہب اسی طرح پھلتا پھولتا اور فروغ پاتا رہا، اور مصر میں اس کے فقہاء کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ البتہ دولتِ ایوبیہ کے آخر دور میں اس کو کچھ زوال آنے لگا۔[22]

جس نے سب سے پہلے مذاہبِ اربعہ کے لئے ایک ہی مدرسہ میں چار جداگانہ نصابِ تعلیم رائج کئے وہ مصر کا صالح نجم الدین ایوب تھا جس نے قاہرہ میں اپنے مدرسہ صالحیہ میں ۶۴۱ھ میں یہ نظام تعلیم جاری کیا۔[23] پھر تو

---

[21] مقریزی، الخطط۔ ج ۲۔ ص ۳۴۳

[22] مقریزی، الخطط۔ ج ۲۔ ص ۳۶۳

[23] ایضاً ج ۲۔ ص ۳۷۴۔ تحفۃ الاحباب للسخاوی ص ۹۱۔

اس قسم کے بہت سے مدرسے حکومتِ ترکیہ اور چرکسیہ میں قائم ہو گئے۔[143]

اس کے بعد ہی دولتِ ترکیہ میں چاروں مذاہب کے لئے علیحدہ علیحدہ قاضی مقرر کرنے کا طریقہ رائج ہوا۔ اس نئے نظام کی بدولت عرصۂ دراز کے بعد مصر میں احناف کو منصبِ قضاء پھر ملنے لگا، کیونکہ فاطمیوں کے عہدِ حکومت میں ان کو اس سے محروم رکھا گیا تھا۔ اور سلطنتِ ایوبیہ کے دور میں قاضی تو شافعی مذہب کا ہوتا تھا، لیکن اس کے نائب کے طور پر حنفی، مالکی اور حنبلی بھی اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔

پھر جب مصر پر عثمانیوں کو تسلط حاصل ہوا تو انہوں نے یہ منصبِ قضاء صرف حنفیوں کے لئے مخصوص کر دیا (اور اس طرح مذہبِ حنفی حکومت کا قانون بن گیا) اور حکومت کے امراء و حکام نے بھی اسی مذہب کو اختیار کر لیا۔ بلکہ وہاں کے اکثر اہلِ علم بھی منصبِ قضاء حاصل کرنے کے لئے اسی مذہب کی طرف راغب ہو گئے۔ لیکن شہروں کی طرح مصر کے شمالی اور جنوبی دیہاتی علاقوں میں اس مذہب کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی (کہ دیہی باشندوں کو سرکاری عہدوں کا لالچ یا امید نہیں ہوتی)۔ اس وقت سے لے کر اب تک مصر میں یہی صورتِ حال ہے۔

مذہبِ حنفی دیگر ممالک میں:

اب جہاں تک بقیہ اسلامی ممالک میں مذہبِ حنفی کے داخل ہونے کی تاریخ کا تعلق ہے۔ تو ہر ملک میں اس کے داخلہ کی تاریخ بیان کرنا

---

[143] مقریزی، الخطط۔ ج ۲ ص ۲۷۲

بہت مشکل ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ چوتھی صدی میں اس کے مختلف علاقوں میں رواج پانے کا حال بیان کر سکتے ہیں جس کی تفصیل مقدسی نے احسن التقاسیم میں ہر اقلیم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھی ہے۔

اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ (چوتھی صدی میں) یمن کے دونوں شہروں صنعا اور صعدہ کے اکثر باشندوں کا یہی مذہب تھا۔[144] اس کے علاوہ عراق کے فقہاء و قضاۃ بھی اسی مذہب کے پیرو تھے۔[145] ملک شام میں بھی یہی مذہب رائج تھا اور اس کو وہاں اتنا رواج حاصل تھا کہ وہاں کوئی شہر یا قصبہ مشکل سے ایسا ملتا تھا جس میں کوئی حنفی موجود نہ ہو، وہاں کے قضاۃ بھی اکثر حنفی المذہب ہوتے تھے۔[146] البتہ فاطمی خلافت کے زمانہ میں وہاں کے تمام امور فاطمیوں کے مذہب کے مطابق طے ہوتے تھے جیسا کہ مصر میں ہوتا تھا۔[147]

دوسری جانب مشرقی ممالک یعنی خراسان، سجستان اور ماوراء النہر وغیرہ میں یہی مذہبِ حنفی رائج تھا، وہاں صرف چند ایک علاقے ایسے تھے جہاں کے باشندے شافعی المذہب تھے۔[148] اقلیم دیلم میں جرجان کے سب باشندے اور طبرستان کے بعض حصوں کے باشندے حنفی مذہب کے پیرو تھے۔[149]

---

[144] احسن التقاسیم۔ ص ۹۶

[145] ایضاً۔ ص ۱۲۷

[146] ایضاً۔ ص ۱۷۹-۱۸۰

[147] ایضاً۔ ص ۲۰۲

[148] احسن التقاسیم۔ ص ۳۳۳-۳۳۶

[149] احسن التقاسیم۔ ص ۳۶۵

اقلیم رحاب میں دبیل کے اکثر باشندے اسی مذہب کے پیرو تھے۔ اور اس اقلیم کے دیگر علاقوں مثلاً ران، آرمینیہ، آذربیجان اور تبریز کے بعض شہروں میں اس کے پیرو ملتے تھے اگرچہ وہ اکثریت میں نہیں تھے۔[۱۳۱]

اقلیم جبال میں سے رے کے اکثر باشندوں کا یہی مذہب تھا۔[۱۳۲] اور اقلیم خوزستان جس کو پہلے اہواز کہتے تھے اور آج کل محمرہ کہتے ہیں، وہاں بھی یہ مذہب کثرت سے رائج تھا اور وہاں حنفی فقہاء، ائمہ اور اہلِ علم بڑی تعداد میں موجود تھے۔[۱۳۳]

اقلیم فارس میں بھی احناف بڑی تعداد میں موجود تھے، البتہ وہاں اہلِ سنّت کے مذاہب میں سے مذہبِ ظاہری کو غلبہ اور اکثریت حاصل تھی اور منصبِ قضاء پر یہی ظاہری لوگ فائز ہوتے تھے۔[۱۳۴] اسی طرح سندھ کے شہر اور قصبات فقہائے حنفیہ سے خالی نہیں تھے۔[۱۳۵]

یاقوت کی "معجم البلدان" میں مذکور ہے کہ رے کے باشندے تین فرقوں میں منقسم تھے۔ اوّل شافعی جو سب سے کم تھے۔ دوم احناف جو شوافع سے زیادہ تھے۔ سوم شیعہ جو سوادِ اعظم تھے (یعنی اکثریت میں تھے)[۱۳۶] پھر بعض اسباب کی بنا پر اوّل الذکر دونوں مذہب تو فنا ہو گئے اور

---

۱۳۱ احسن التقاسیم ص ۳۷۸

۱۳۲ ایضاً۔ ص ۳۹۵

۱۳۳ ایضاً۔ ص ۴۱۵

۱۳۴ ایضاً۔ ص ۴۳۹

۱۳۵ ایضاً۔ ص ۴۸۱

۱۳۶ یاقوت، "معجم البلدان" ج ۲، ص ۸۹۳-۸۹۲۔

شیعوں کو وہاں غلبہ حاصل ہو گیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

یاقوت نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اہلِ سجستان سب کے سب حنفی المذہب تھے۔[۱۳۷]

ابن تغری بردی نے "المنہل الصافی" میں بیان کیا ہے کہ ہندوستان میں بنگال کے تمام حکمران حنفی المذہب تھے۔[۱۳۸]

یہ چوتھی صدی اور گزشتہ ادوار میں مذہبِ حنفی کے مسلم ممالک میں رواج پانے کا سرسری جائزہ ہے۔ آج کل یہ مذہب دنیا کے کن کن حصوں میں پایا جاتا ہے اس کی تفصیل ہم اس مقالہ کے آخر میں بیان کریں گے۔[۱۳۹]

مذہبِ حنفی اور مذاہبِ متکلمین :

احناف عقائد میں امام ابو منصور ماتریدی حنفی کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن ماتریدیوں اور امام اشعری کے متبعین کے مابین صرف چند مسائل میں

---

۱۳۷ یاقوت "معجم البلدان" ج ۲۔ ص ۹۹۹

۱۳۸ المنہل ج ۵۔ ص ۱۵۵

۱۳۹ مختصر یہ کہ آجکل (پندرھویں صدی ہجری کے آغاز میں) حنفی مذہب کے پیرو افغانستان، پاکستان، ہندوستان (بھارت)، بنگلہ دیش، عراق، ترکی، شام، مشرقی ترکستان، مغربی ترکستان (ترکمانستان، تاجکستان، ازبکستان، تاترستان وغیرہ)، بوسنیا، البانیہ و بلقان میں اکثریت میں پائے جاتے ہیں۔ ایران، انڈونیشیا، مصر، برازیل، برما، سری لنکا، ملائیشیا، تھائی لینڈ، سعودی عرب و دیگر ممالک میں اقلیت میں ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق احناف دنیا کے کل مسلمانوں کا دو تہائی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تعداد آجکل پوری دنیا میں تقریباً ۸۶ کروڑ ہے جیسا کہ اس کی تفصیل ہم نے آگے اس مقالہ کے اختتام کلام کے حاشیہ میں درج کی ہے۔ (معراج محمد)

اختلاف ہے۔ اگرچہ احناف میں بھی کچھ اشعری ہوتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "کسی حنفی کا اشعری ہونا تعجب کی بات ہے"[۳۰]

امام سبکی کی طبقات میں ہے کہ احناف اکثر اشعری ہوتے ہیں یعنی وہ اشاعرہ کے عقائد رکھتے ہیں۔ ان عقائد کو صرف وہی احناف چھوڑتے ہیں جو معتزلہ عقائد اختیار کر لیتے ہیں[۳۱]

امام سبکی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ انہوں نے "عقیدۃ الطحاوی" کو بغور پڑھا جس کے متعلق طحاوی کا دعویٰ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور صاحبینؒ (امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) کے یہی عقائد تھے، تو سبکی کو صرف تیرہ مسائل ایسے ملے جن میں طحاوی نے اشعری سے اختلاف کیا تھا، ان میں سے بھی چھ مسائل ایسے تھے جن میں حقیقی معنوں میں اختلاف تھا اور بقیہ مسائل میں صرف لفظی اختلاف تھا۔[۳۲]

غالباً امام سبکی کا مقصد یہ ہے کہ ان جزوی مسائل میں اختلاف کرنے کی وجہ سے احناف اشاعرہ کے زمرہ سے خارج قرار نہیں دیئے جا سکتے، اگرچہ وہ نام کے لحاظ سے ماتریدیہ ہی کہلائیں، کیونکہ آگے چل کر سبکی خود اس بات کی تصریح کرتے ہیں کہ ان جزوی مسائل میں احناف اور اشاعرہ کا باہمی اختلاف ایسا ہی ہے جیسے خود اشاعرہ کے درمیان آپس میں اختلافات[۳۳] پائے جاتے ہیں، کیونکہ یہ تیرہ مسائل سب کے سب نہ شیخ ابو الحسن اشعریؒ سے ثابت ہیں اور نہ امام ابو حنیفہؒ سے۔

---

۳۰ تاریخ الکامل لابن اثیر ج ۸ ص ۲۵، الفوائد البہیہ ص ۱۴۰ و ص ۲۰، مقریزی ج ۲ ص ۳۵۹

۳۱ طبقات السبکی ج ۲۔ ص ۱۱

۳۲ ایضاً۔

مذہبِ مالکی

مذہبِ مالکی کا آغاز

یہ مذہب امام مالک بن انس اصبحیؒ کی طرف منسوب ہے، جن کی ولادت مشہور روایت کے مطابق ۹۳ھ میں ہوئی، اور وفات صحیح روایات کے لحاظ سے ۱۷۹ھ میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔ قدامت کے لحاظ سے مذاہب اربعہ میں اس کا دوسرا نمبر ہے۔ امام مالکؒ کے اصحاب کو اہل حدیث کہا جاتا ہے۔

امام مالکؒ نے احکام شرعیہ کے ماخذ کے طور پر ان ماخذ کے علاوہ جو دیگر ائمہ کے نزدیک بھی معتبر ہیں، ایک اور ماخذ بھی تسلیم کیا ہے، اور وہ "اہل مدینہ کا عمل" ہے۔ یہ اصول اسی مذہب کی خصوصیت ہے۔[۱]

مذہب مالکی کی نشوونما امام مالکؒ کے وطن مدینہ میں ہوئی، پھر یہ پورے حجاز میں پھیل گیا۔ یہ حجاز میں غلبہ حاصل کرنے کے بعد بصرہ، مصر اور اس کے قریبی بلادِ افریقیہ، اندلس، صقلیہ (سسلی)، مغربِ اقصیٰ (مراکش وغیرہ) اور سوڈان کے ان شہروں میں غالب ہو گیا جو اسلام قبول کر چکے تھے۔[۲]

شہر بغداد میں بھی اس نے خاصا فروغ پایا لیکن پھر چوتھی صدی کے

---

۱ مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۴۴۷

۲ الدیباج۔ ص ۱۲

بعد وہاں کمزور پڑ گیا۔ اسی طرح پانچویں صدی کے بعد یہ بصرہ میں زوال پذیر ہو گیا۔

خراسان کے شہر قزوین اور ابہر میں اس کو خوب فروغ حاصل ہوا، اور اسی طرح شروع میں نیشاپور میں بھی اس کو غلبہ حاصل ہوا اور ان تمام بلاد و ممالک میں اس مذہب کے ائمہ اور مدرس موجود تھے۔

یہ مذہب بلادِ فارس میں بھی پہنچا نیز یمن میں اور ملکِ شام کے بہت سے شہروں میں بھی اس کی خوب اشاعت ہوئی۔[63]

ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جبکہ یہ خود اپنے سرچشمہ یعنی مدینہ میں گمنام سا ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب ابن فرحون سنہ ۷۹۳ھ میں یہاں کے قاضی مقرر ہوئے تو انہوں نے اس کو گوشۂ گمنامی سے نکالا اور وہاں دوبارہ متعارف کرایا۔[64]

مذہبِ مالکی مصر میں:

علامہ مقریزی اپنی کتاب "خطط" میں بیان کرتے ہیں کہ مصر میں اس مذہب کو سب سے پہلے عبدالرحیم بن خالد بن یزید بن یحییٰ مولیٰ جمح لائے۔ پھر عبدالرحمٰن بن قاسم نے اس کی خوب اشاعت کی۔ پھر امام مالکؒ کے تلامذہ وہاں بہت بڑی تعداد میں آ گئے۔ جس کی وجہ سے یہ مذہب حنفی مذہب سے زیادہ پھیلا، بلکہ ایسا وقت آیا کہ مصر میں مذہبِ حنفی کے جاننے والے

---

[63] الدیباج ص ۱۲

[64] نیل الابتہاج، جلد اوّل ص ۱۳۱۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۶۔ ۴۴۷

برائے نام رہ گئے۔[65]

مقریزی کے اس بیان کی تائید امام سیوطی کی "اوائل" سے بھی ہوتی ہے۔[66]

لیکن سیوطی نے اپنی کتاب "حسن المحاضرہ" میں "الدیباج" سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مصر میں مذہبِ مالکی کو لانے والے پہلے شخص عثمان بن الحکم جذامی ہیں۔[67] "الدیباج" کے اصل الفاظ یہ ہیں: "مشہور یہ ہے کہ یہ امام مالکؒ کے مصری تلامذہ میں سے ہیں۔ اور یہی پہلے شخص ہیں جو امام مالک کے علم (فقہ) کو مصر میں لائے۔ اور مصر نے ان سے زیادہ شریف و نبیل شخص پیدا نہیں کیا۔" اس کے بعد لکھتا ہے کہ انہوں نے ۱۶۳ھ میں وفات پائی۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ دونوں بیانات درست ہیں اور ان میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ حافظ ابن حجر [illegible] نے اپنی "تہذیب التہذیب" میں عثمان جذامی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "ابن وہب کا بیان ہے کہ مصر میں سب سے پہلے امام مالکؒ کے مسائل (اور فقہ) لانے والے عثمان بن الحکم اور عبدالرحیم بن خالد بن یزید ہیں۔"[68] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات نے جب امام مالکؒ سے تعلیم حاصل کر لی تو یہ دونوں ایک ساتھ مصر واپس آئے۔ اور دونوں نے یہاں مالکی فقہ کو رواج دیا۔

مقریزی کی "الخطط" میں ہے کہ "مصر میں شافعی مذہب کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اس مذہب (مالکی) پر عمل ہوتا رہا، اور وہاں کے قضاۃ بھی انہی

---

[65] خطط المقریزی۔ ج ۲۔ ص ۳۳۴

[66] سیوطی: محاضرۃ الاوائل ج ۱۔ ص ۷۹

[67] سیوطی: حسن المحاضرہ ج ۱۔ ص ۱۳۲

[68] تہذیب التہذیب لابن حجر۔ ج ۷۔ ص ۱۰

دونوں مذاہب کے پیرو ہوا کرتے تھے یا بعض اوقات حنفی مسلک کا پیرو ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ (اسمٰعیلی) قائد جوہر فاتحانہ مصر میں داخل ہوا تو اس وقت سے یہاں مذہبِ شیعہ رائج ہوا اور عدالتی فیصلے اور فتوے بھی اسی مذہب کے مطابق دیئے جانے لگے، اور دیگر مخالف مذاہب کے فیصلوں پر عملدرآمد بند کر دیا گیا۔"[9]

راقم کہتا ہے کہ مصر میں اس مذہب (مالکی) کو دوبارہ زندگی اس وقت ملی جب دولتِ ایوبیہ کا دور آیا۔ عہدِ ایوبی میں اس مذہب کے فقہاء کے لئے مدارس قائم کئے گئے۔ پھر جب دولتِ ترکیہ بحریہ کے سلطان ظاہر بیبرس نے چاروں مذاہب کے قاضی مقرر کئے تو مالکی مذہب کا قاضی بھی مستقل بنیاد پر مقرر ہونے لگا اور اس مذہب کا قاضی شافعی قاضی کے بعد دوسرے درجہ پر شمار کیا جانے لگا، جبکہ دولتِ ایوبیہ میں قاضی کا اصل عہدہ تو صرف شافعیوں کے لئے مخصوص ہوتا تھا، البتہ شافعی قاضی کے ساتھ بقیہ تین مذاہب کے نمائندے بھی موجود رہتے تھے۔

یہ مذہب مصر میں اب تک مذہبِ شافعی کے ساتھ ساتھ رائج ہے، خصوصاً بالائی مصر (جنوبی مصر) میں اس کا زیادہ رواج ہے۔

(شمالی) افریقیہ اور اندلس میں :

ابتدائی دور میں (شمالی) افریقیہ کے مسلمان سُنن و احادیث پر عمل کرتے تھے، پھر جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے فقہِ حنفی کو رواج حاصل ہوا۔ اس

---

[9] خطط المقریزی ج ۲۔ ص ۳۳۴

کے بعد جب ۴۰۷ھ میں مُعِزّ بن بادیس نے یہاں کی حکومت سنبھالی تو اس نے تمام باشندگانِ (شمالی) افریقیہ کو اور اس سے متصل بلادِ مغرب (مراکش) کے باشندوں کو مذہبِ مالکی پر عمل کرنے پر مجبور کیا اور اس طرح تمام فقہی اختلافات کو جڑ سے ختم کر دیا۔[10]

مُعِزّ بن بادیس کی اس حکمتِ عملی کی وجہ سے مذہبِ مالکی کو (شمالی) افریقیہ اور تمام بلادِ مغرب پر مستقل غلبہ حاصل ہو گیا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مغرب (مراکش) کا شاعر مالک بن المرحل[11] المالکی کہتا ہے ؎

مَذْهَبِيْ تَقْبِيْلُ خَدٍّ مُذْهَبِ ۔۔۔ سنہری (رگالی) رخساروں کا بوسہ لینا میرا مذہب ہے

سَيِّدِيْ مَا ذَا تَرَىٰ فِيْ مَذْهَبِيْ ۔۔۔ جناب! میرے مذہب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ (دیکھو) مالک کی رائے کی مخالفت نہ کرنا

لَا تُخَالِفْ مَالِكًا فِيْ رَأْيِهٖ

فَعَلَيْهِ جُلُّ اَهْلِ الْمَغْرِبِ ۔۔۔ کیونکہ تمام اہلِ مغرب اسی کی رائے اور مذہب کے پیرو ہیں۔[12]

ان ممالک میں آج بھی اسی مذہب کا غلبہ ہے۔ فاسی اپنی کتاب "العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین" میں لکھتا ہے: "اہلِ مغرب سب کے سب مالکی المذہب ہیں سوائے معدودے چند لوگوں کے جو سُنن و آثار پر

---

[10] المدیباج ص ۱۰۰۔ ابن خلکان ج ۲۔ ص ۱۲۷۔ ابن الاثیر ج ۹ ص ۱۵۸ مراٰۃ الادب ج ۲ ص ۹۰

[11] مترجم کہتا ہے کہ اس شاعر کا اصل نام مالک بن عبدالرحمٰن "ابن المرحل" مالقی مصمودی ہے۔ اس کی وفات ۶۹۹ھ/۱۳۰۰ء میں ہوئی۔ شاعرِ مغرب کہلاتا ہے۔ اس کا دیوان ابھی مخطوطہ کی شکل میں ہے (ملاحظہ ہو عبداللہ گنون بالرسالۃ المختصرۃ من "ذکریات مشاہیر رجال المغرب")۔ (معراج محمد)

[12] ماخوذ از ابن سمیع کی قلمی بیاض کا صفحہ ۱۸۱۔ ۱۸۲ مجامیع نیز مراٰۃ الادب ج ۲ ص ۹۰۔

(مترجم کہتا ہے کہ شاعر نے اپنے اس شعر میں صنعتِ استخدام استعمال کی ہے یعنی تیسرے مصرعہ میں پہلے تو وہ "مالک" سے خود اپنی طرف اشارہ کرتا ہے پھر آخری مصرعہ میں نام کی یکسانیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قاری کا ذہن امام مالکؒ کی طرف منتقل کر دیتا ہے)۔ معراج محمد۔

عمل کرتے ہیں۔[113]

جہاں تک اندلس کا تعلق ہے تو وہاں پہلے مذہبِ اوزاعی غالب تھا۔ اس مذہب کو وہاں سب سے پہلے صَعصَعہ بن سلام اپنے ساتھ لے کر گئے۔ وہاں یہ مذہب امیر ہشام بن عبدالرحمٰن کے عہدِ حکومت تک غالب رہا۔[114] بالآخر دو سو سال تک وہاں رائج رہنے کے بعد اس کو زوال آگیا اور مالکی مذہب نے اس کی جگہ لے لی۔[115]

"نیل الابتہاج" میں مذکور ہے کہ اہلِ اندلس مذہبِ اوزاعیؒ پر کاربند تھے یہاں تک کہ امام مالکؒ کے تلامذہ میں سے پہلے طبقہ کے علماء اس ملک میں آئے، مثلاً زیاد بن عبدالرحمٰن، غازی بن قیس، قرعوس بن العباس وغیرہ۔ یہاں آکر انہوں نے امام مالکؒ کے مذہب کی اشاعت کی۔ اور امیر ہشام بن عبدالرحمٰن نے بھی اس مذہب کو قبول کرکے لوگوں کو اس کی طرف رغبت دلائی، چنانچہ وہاں کے بہت سے باشندوں نے اسی مذہب کو اختیار کرلیا اور (جنہوں نے نہیں کیا) ان کو بزورِ شمشیر اس کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا، سوائے ان لوگوں کے جن کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔[116]

ضبی کی "بغیۃ الملتمس" میں ہے کہ "اندلس میں مذہبِ مالکی یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر مصمودی کی کوششوں سے پھیلا۔ اُن سے بے شمار لوگوں نے فقہ (مالکی) کی تعلیم حاصل کی۔ ان کا انتقال ۲۳۴ھ میں ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ ۲۳۳ھ

---

[113] العقد الثمین ج ۱۔ ص ۱۳۵

[114] بغیۃ الملتمس۔ ص ۳۱۱

[115] الدیباج۔ ص ۱۳ سطر ۲

[116] نیل الابتہاج۔ ص ۱۹۱

میں ہوا۔[117]

مقریزی نے "الخطط" میں اور ابن فرحون نے اپنی "الدیباج" میں لکھا ہے کہ مذہبِ مالکی کو سب سے پہلے اندلس میں لانے والے زیاد بن عبدالرحمٰن القرطبی تھے۔ ان کا لقب شبطون تھا۔ یہ یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر (مصمودی) سے پہلے اندلس پہنچے تھے، کیونکہ زیاد کی وفات ۲۰۳ھ یا ۲۰۴ھ میں ہوئی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس سے بھی پہلے یعنی ۱۹۹ھ میں ہوئی ہے۔[118]

"نفح الطیب" میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"حکم کے والد ہشام بن عبدالرحمٰن کے عہدِ حکومت میں اندلس سے ایک جماعت حج کے لیے گئی جس میں شبطون، قرعوس بن العباس، عیسیٰ بن دینار اور سعید بن ابی ہند وغیرہ شامل تھے۔ وہ جب حج سے واپس آئے تو اپنے اہلِ وطن کو امام مالکؒ کے فضل و کمال، ان کی وسعتِ علم اور لوگوں میں ان کی قدر و منزلت کے واقعات و حالات سنائے۔ اس سے اندلس میں ان کی بڑی شہرت ہوئی۔ اسی وقت سے اس ملک میں ان کا مذہب اور فقہی مسائل رواج پانے لگے۔ علماء کی اس جماعت کے سرخیل شبطون تھے، اور یہی امام مالکؒ کی "موطا" کو مکمل اور جامع صورت میں سب سے پہلے اندلس میں لائے تھے۔ اور یحییٰ بن یحییٰ (مصمودی) نے انہی سے یہ کتاب پڑھی تھی۔ پھر شبطون نے ان کو امام مالکؒ کے پاس جانے کا مشورہ دیا (تاکہ براہِ راست ان سے اس کتاب کی تعلیم

---

[117] بغیۃ الملتمس۔ ص ۴۹۶

[118] خطط المقریزی۔ ج ۲۔ ص ۳۳۳ - الدیباج۔ ص ۱۸۸

مالکی اختیار کرنے کی) یہی وجہ بیان کی ہے، لیکن اس نے یہ واقعہ عبدالرحمٰن الداخل کے عہدِ حکومت میں بتایا ہے۔ (جو ہمارے خیال میں صحیح نہیں ہے کیونکہ) تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اندلس میں مالکی مذہب عبدالرحمٰن الداخل کے بیٹے ہشام کے عہدِ حکومت میں داخل ہوا تھا۔

پھر اس مذہب کا اندلس اور دیارِ مغرب میں خوب دور دورہ ہوا کیونکہ حکم بن ہشام کے عہدِ حکومت میں تمام فتوے اسی مذہب کے مطابق دیئے جانے لگے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مالکی عالم یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر (مصمودی) امیر حکم بن ہشام کے معتمد مقربین میں سے تھے۔ وہ ان کی کسی بات کو رد نہیں کرتا تھا اور ہر مشورہ قبول کرتا تھا۔ قضاۃ کا تقرر بھی انہیں کے مشورہ سے کرتا تھا۔ انہی وجوہات کی بنا پر جس طرح مشرق میں قاضی ابو یوسفؒ کے ذریعہ فقہ حنفی کو رواج حاصل ہوا اسی طرح اسلامی مغربی ممالک میں یحییٰ بن یحییٰ کے ہاتھوں مالکی مذہب کی عام اشاعت ہوئی۔ ۱۱۷

ابن خلدون نے دیارِ مغرب اور اندلس میں مالکی مذہب کے فروغ پانے کی ایک اور توجیہ پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"امام مالکؒ کے مذہب کو خاص طور پر اہلِ مغرب و اندلس نے اختیار کیا۔ اگرچہ دیگر مقامات میں بھی مالکی المذہب لوگ ملتے تھے، لیکن اہل مغرب و اندلس نے تو امام مالکؒ کے علاوہ کسی اور امام کی تقلید اختیار ہی نہیں کی سوائے معدودے چند لوگوں کے۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ (مشرقی

---

۱۱۷ خطط المقریزی۔ ج ۲۔ ص ۳۳ و ۳۳۳۔ نفح الطیب ج ۱ ص ۳۵۱

ایضاً ج ۲۔ ص ۱۹۰۔ بغیۃ الملتمس ص ۴۹۶

حاصل کریں)۔ چنانچہ وہ (مدینہ منورہ) گئے اور براہ راست امام مالکؒ سے "موطا" کی تعلیم حاصل کر کے واپس آئے۔ اس طرح اندلس میں مذہب مالکی کی اشاعت ان کے اور زیاد (شبطون) اور عیسیٰ بن دینار کے ہاتھوں سرانجام پائی۔ ۱۱۹

پھر ایک دوسری جگہ وہ لکھتا ہے:

"بعض روایات کے مطابق شاہِ اندلس نے لوگوں کو مذہبِ مالکی قبول کرنے پر اس لئے مجبور کیا کہ ایک مرتبہ امام مالکؒ نے بعض اندلسی حاجیوں سے ان کے بادشاہ کے حالات و خصائل دریافت کئے۔ انہوں نے اپنے بادشاہ کی جو عادات و صفات بیان کیں وہ امام مالکؒ کو بہت اچھی لگیں۔ فرمانے لگے کہ "ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے حرم کو تمہارے بادشاہ کی آمد سے زینت بخشے" یا اسی طرح کے کچھ اور الفاظ کہے (جن سے شاہِ اندلس کی تحسین و تعریف ہوتی تھی) امام مالکؒ نے (آخری شاہِ اندلس کی تعریف میں) یہ کلمات اس وجہ سے کہے کہ وہ (اس زمانہ میں) بنو عباس کے طرزِ عمل کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کو (ابتدا میں) عباسی خلفاء سے جو تکالیف پہنچی تھیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ بہرحال جب شاہِ اندلس کو امام مالکؒ کے ان (مذکورہ بالا) کلمات کا علم ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ آپ کی جلالتِ علمی اور دینی مرتبہ سے واقف ہوا تو اس نے لوگوں کو مذہبِ اوزاعیؒ ترک کر کے مذہبِ مالکی قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ ۱۲۰

ابن نباتہ نے بھی اپنی کتاب "سرح العیون" ۱۲۱ میں (شاہِ اندلس کے مذہب

---

۱۱۹ نفح الطیب، ج ۱۔ ص ۳۵۰

۱۲۰ ایضاً ج ۲۔ ص ۴۹۹

۱۲۱ سرح العیون۔ ص ۱۴۱

اسلامی ممالک میں حریف عباسی خلافت کے غلبہ کی وجہ سے) اہلِ مغرب واندلس (حج کی غرض سے) اکثر حجاز جایا کرتے تھے اور یہی ان کے سفر کی انتہا تھی۔ اس زمانہ میں مدینہ دار العلم تھا۔ یہیں سے علم عراق گیا تھا۔ لیکن عراق ان کے راستہ میں نہیں پڑتا تھا۔ لہٰذا انھوں نے جو کچھ علم حاصل کیا وہ علمائے مدینہ اور ان کے امام و شیخ امام مالکؒ سے ہی حاصل کیا۔ امام مالکؒ سے قبل وہ آن کے شیوخ سے استفادہ کرتے تھے اور امام مالکؒ کی وفات کے بعد آن کے تلامذہ سے فیض حاصل کیا۔ الغرض اہلِ مغرب واندلس نے (ہر دور میں) حصولِ علم کے لئے انہی (علمائے مدینہ) کی طرف رجوع کیا اور ان کے علاوہ کسی دوسرے امام کی تقلید نہیں کی کیونکہ دوسرے مذاہب ان لوگوں تک پہنچ ہی نہ سکے۔

اس کے علاوہ مالکی مذہب کے وہاں رائج ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اہلِ مغرب واندلس طبیعت کے لحاظ سے بدوی تھے اور ان پر بدوی مزاج کا غلبہ تھا۔ وہ اہلِ عراق کی مدنیت اور تمدن کی طرف مائل نہیں تھے۔ لہٰذا اپنی اسی بدویت کی مناسبت سے وہ اہلِ حجاز کی طرف زیادہ مائل تھے (کہ وہاں بھی بدویت پائی جاتی تھی)۔ یہی وجہ ہے کہ مالکی مذہب ان کا پسندیدہ مذہب رہا ہے۔ کیونکہ دیگر مذاہب کی طرح اس مذہب پر تہذیب و تمدن کی تنقیحات اور موشگافیوں نے اپنا اثر نہیں ڈالا۔ یہ ان سے دور ہی رہا۔"[۲۲۳]

راقم کہتا ہے کہ اس بارے میں مقدسی کا وہ بیان بھی پیشِ نظر رکھنا

---

۲۲۳ مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۴۴۹

چاہئے جو مذہبِ حنفی کے سلسلہ میں اوپر گزر چکا ہے جس سے اندلس میں مذہبِ حنفی کے زوال اور مذہبِ مالکی کے عروج کی وضاحت ہوتی ہے۔[۲۲۴]

مذہبِ مالکی مغربِ اقصیٰ (مراکش) میں

پھر جب پانچویں صدی ہجری میں مغربِ اقصیٰ (مراکش) میں بنو تاشفین کی حکومت قائم ہوئی تو وہ اندلس پر بھی قابض ہو گئے۔ جب اس خانوادہ کا سلطان ثانی امیر المسلمین علی بن یوسف بن تاشفین تختِ نشین ہوا تو اس نے علماء و فقہاء اور دینی شخصیات کو بہت اہمیت دی، حتیٰ کہ وہ حکومت کا کوئی کام فقہاء سے مشورہ لئے بغیر انجام نہیں دیتا تھا۔ اس نے تمام قضاۃ کے لئے یہ لازمی قرار دے دیا تھا کہ وہ ہر چھوٹے یا بڑے مقدمہ کا فیصلہ چار فقہاء کی موجودگی میں کیا کریں۔ اس طرح اس کے دورِ حکومت میں فقہاء کو بڑی قدر و منزلت حاصل ہو گئی۔ لیکن جب تک کسی کو مالکی مذہب کا علم حاصل نہ ہو وہ سلطان کی بارگاہ میں تقرب حاصل نہیں کر سکتا تھا اور نہ اس کی کوئی اہمیت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دورِ حکومت میں فقہِ مالکی اور اس کی کتابیں مقبولِ عام ہو کر خوب رواج پا گئیں۔ فقہی مسائل اور قانونی معاملات میں انہی پر عملدرآمد ہوتا تھا اور دوسری کتابوں کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ یہ روش اس قدر بڑھی کہ لوگوں نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں غور کرنا چھوڑ دیا اور ان سے بالکل مستغنی ہو گئے۔ کوئی ان کی طرف توجہ ہی نہیں دیتا تھا۔[۲۲۵]

---

۲۲۴ دیکھئے اس کتاب کا صفحہ ۹۵-۹۶ و ۹۳۔

۲۲۵ المعجب، مراکشی، ص ۱۲۲ و ۱۲۳۔

پھر جب بنو تاشفین کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں موحدین ان کی مملکت پر قابض ہو گئے تو اس نئے خانوادہ کا خلیفہ عبدالمومن بن علی اس معاملہ میں اپنی پیشرو حکومت کے مسلک پر قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مغرب فقہی فروعات میں مالکی مذہب پر کاربند رہے، اور عقائد میں امام ابوالحسن اشعریؒ کے اصولوں سے وابستہ رہے۔[24]

لیکن آثار و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ عبدالمومن اور اس کے بیٹے یوسف دونوں کے دل میں اصل مقصد یہ پوشیدہ تھا کہ کسی طرح مذہب مالکی کو ختم کر کے اس کی جگہ قرآن و حدیث کے ظاہر پر لوگوں سے عمل کرایا جائے۔ لیکن یہ دونوں اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔[25]

البتہ جب اس بانی خاندان کا پوتا یعقوب بن یوسف بن عبدالمومن تخت نشین ہوا تو اس نے علانیہ ظاہری مذہب اختیار کر لیا اور مالکی مذہب کو ترک کر دیا۔ یعقوب کے اس اقدام کی وجہ سے اس کے عہدِ حکومت میں مذہب ظاہری کو عروج حاصل ہوا۔ اہلِ مغرب کی ایک بڑی تعداد نے یہ مذہب اختیار کر لیا۔ وہ لوگ مذہب ظاہری کے امام ابن حزم کی نسبت سے "حزمیہ" کہلاتے تھے۔ لیکن یہ لوگ ہمیشہ مالکیوں سے دبے ہوئے اور ان کے نرغہ میں رہتے تھے، لہٰذا یہ ادھر ظہور میں آنے کے بعد سلطان یعقوب کے دور ہی میں منتشر ہو گئے۔ پھر یعقوب نے اپنے عہدِ حکومت کے اواخر میں بعض شہروں میں شافعی مسلک کے قاضی مقرر کئے اور ان کی طرف مائل ہو گیا۔[26]

---

۲۴ الکامل لابن الاثیر۔ ج ۱۱۔ ص ۱۱۸

۲۵ "المعجب" مراکشی، ص ۲۰۳

۲۶ "الکامل" لابن الاثیر۔ ج ۱۱۔ ص ۱۱۸

مراکشی اپنی "المعجب" میں لکھتا ہے:

"یعقوب کے عہدِ حکومت میں علم فقہ کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ اور فقہاء بھی اس سے ڈرے سہمے رہنے لگے۔ اس نے فقہ کی کتابوں کے بارے میں حکمِ عام جاری کر دیا کہ ان میں سے آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی علیحدہ کر کے ان سب کتابوں کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم پر عمل کیا گیا اور سلطنتِ موحدین کے تمام شہروں میں فقہ (مالکی) کی سب کتابیں جلا دی گئیں مثلاً سحنون کی "المدونہ"، ابن یونس کی کتاب "شرح المدونہ" ابن ابی زید کی "نوادر" اور "مختصر"، البرادعی کی "التہذیب" اور ابن حبیب کی "واضحہ" اور اس قسم کی بہت سی اہم کتابیں آگ میں جھونک دی گئیں۔ میں اس زمانہ میں شہر فاس میں تھا میں نے وہاں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کتابوں کے گٹھڑ کے گٹھڑ لائے جاتے اور ان کے ڈھیر بنا کر رکھ دیئے جاتے، پھر ان میں آگ لگا دی جاتی۔

کتب فقہ کا ذخیرہ نذرِ آتش کرنے کے بعد یعقوب نے کتب احادیث میں سے (مختلف موضوعات و مسائل پر) احادیثِ نبوی جمع کرنے اور ان کو لکھنے و نقل کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً نماز وغیرہ کے مسائل کے بارے میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، موطا امام مالکؒ، سنن ابی داؤد، سنن النسائی، مسند بزار، سنن الدار قطنی، سنن البیہقی اور مسند ابن ابی شیبہ میں سے متعلقہ احادیث لکھنے اور جمع کرنے کا حکم دیا۔ اس سلسلہ میں وہ اس

قدر پُرجوش تھا کہ وہ لوگوں کو یہ مجموعۂ احادیث خود املا کراتا اور ----- ان کے حفظ کرنے کی تلقین کرتا۔ اور جو شخص اِن احادیث کو حفظ کرتا اس کے لئے لباس اور مال و زر کی صورت میں سالانہ وظیفہ مقرر کر دیتا۔[۱۲۹]

مذہبِ مالکی دیگر بلاد میں:

جیسا کہ مقدسی نے اپنی "احسن التقاسیم" میں لکھا ہے، مالکی مذہب چوتھی صدی ہجری میں عراق اور اہواز میں موجود تھا، اور مصر و بلادِ مغرب میں یہ خاصا پھیلا ہوا تھا، اور اندلس میں تو اس کو غلبہ حاصل تھا۔[۱۳۰]

مذہبِ مالکی اور مذاہبِ متکلمین:

تاج الدین سبکی اپنی "طبقات" میں اور "معید النعم" میں بیان کرتے ہیں کہ عقائد میں مالکیہ امام ابوالحسن الاشعری کے پیرو ہیں، یہاں تک کہ کوئی مالکی ایسا نہیں ملے گا جو (عقائد میں) اشعری نہ ہو۔
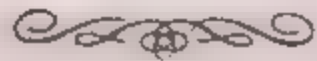
۱۲۹؎ المعجب المراکشی۔ ص ۲۰۳۔

۱۳۰؎ آج کل یعنی پندرھویں صدی ہجری میں مالکی مذہب کے پیرو شمالی مغربی افریقہ کے ممالک مثلاً مراکش، موریطانیہ، تونس، الجزائر اور لیبیا میں اکثریت میں ہیں۔ مصر، سوڈان، شام، لبنان اور حجاز میں ان کی اقلیت ہے ۱۹۳۰ء میں اس مذہب کے مقلدین کی تعداد کا اندازہ ساڑھے چار کروڑ لگایا گیا تھا۔ ۱۲ (معراج محمد)

مذہبِ شافعی

بانیٔ مذہب:

یہ مذہب امام محمد بن ادریس الشافعی القرشی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے جن کی ولادت غزہ میں ۱۵۰ھ میں ہوئی اور وفات مصر میں ۲۰۴ھ میں ہوئی۔

آپ فہم و ذکا اور حافظہ میں بے نظیر تھے۔ آپ کی ذات میں ایسے فضائل جمع تھے جو کسی اور (امام) میں جمع نہیں ہو سکے تھے۔ آپ کا مذہب قدامت کے لحاظ سے مذاہبِ اربعہ میں تیسرا مذہب ہے۔ مالکیوں کی طرح آپ کے متبعین کو بھی "اہلِ حدیث" کہا جاتا ہے[۱۳۱] بلکہ اہلِ خراسان کی اصطلاح میں تو یہ رائج تھا کہ جب وہ علی الاطلاق "اصحابِ حدیث" کہتے تھے تو اس سے وہ صرف شوافع ہی مراد لیتے تھے۔[۱۳۲]

دراصل امام شافعیؒ نے پہلے امام مالکؒ سے ہی تحصیلِ علم کی تھی، پھر بعد میں مستقل طور پر ایک الگ مذہب قائم کیا۔ ابنِ خلدون کہتا ہے "امام شافعیؒ امام مالکؒ سے تحصیلِ علم کے بعد عراق گئے اور وہاں امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں سے ملے اور ان سے (مزید) علم حاصل کیا۔ پھر اہلِ حجاز اور اہلِ عراق کے مسلکوں کو باہم ملا کر ایک الگ مذہب بنایا اور اپنے مذہب میں بہت سے

۱۳۱؎ مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۶ و طبقات السبکی ج ۲۔ ص ۲۸۵۔

۱۳۲؎ طبقات السبکی ج ۲۔ ص ۲۸۵۔

مسائل میں (اپنے استاد) امام مالکؒ سے اختلاف کیا۔[53]

مذہبِ شافعی مصر و دیگر بلاد میں:

طبقات کے مؤلفین بیان کرتے ہیں کہ مذہب شافعی سب سے پہلے مصر میں ظہور پذیر ہوا اور وہاں اس کے متبعین کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی۔ پھر یہ مذہب عراق میں ابھرا اور وہاں بغداد میں اس کو خاصا غلبہ حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ شام، خراسان، توران اور یمن کے بہت سے شہروں میں چھا گیا۔ نیز یہ ماوراء النہر اور بلادِ فارس اور حجاز میں بھی داخل ہوا، اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں بھی پھیلا۔ پھر چوتھی صدی ہجری میں یہ تھوڑا بہت (شمالی) افریقیہ اور اندلس میں بھی پہنچا۔[54]

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، مصر میں مذہب حنفی اور مذہب مالکی کا غلبہ تھا۔ لیکن جب امام شافعیؒ یہاں آئے تو ان کا مذہب پھیلنے لگا اور ان کے متبعین کی تعداد بہت ہو گئی۔[55]

---

[53] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۴۴۷-۴۴۸

[54] الدیباج ص ۱۳۔ الفوائد البہیہ ص ۶

[55] قضاۃ مصر ص ۱۸۔ اپنی اس کتاب میں علی بن عبدالقادر طوخی لکھتا ہے کہ "عیسیٰ بن منکدر قاضی مصر نے امام شافعیؒ کے روبرو کہا کہ جب تم اس شہر میں داخل ہوئے تو اس کا مذہب و مسلک ایک تھا۔ لیکن تم نے آ کر یہاں کے باشندوں میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ قاضی کا مطلب یہ تھا کہ شافعی کے شاگردوں نے امام مالک کے مقلدین کی مخالفت شروع کر دی کیونکہ اہل مصر امام شافعیؒ سے پہلے مالکی مذہب کے سوا کسی دوسرے مذہب سے واقف نہیں تھے" لیکن طوخی کا یہ بیان درست نہیں ہے، کیونکہ اس زمانہ میں مصر میں مذہب حنفی بھی موجود تھا۔ (مصنف)

ابن خلدون کہتا ہے:

"مصر میں امام شافعیؒ کے مقلدین کی تعداد دیگر تمام جگہوں سے زیادہ ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ یہ مذہب عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں پھیل گیا تھا۔ اور شافعی ان تمام ممالک میں درس و تدریس اور فتوے دینے میں حنفیوں کے برابر کے شریک ہو گئے تھے۔ ان دونوں مذاہب کے علماء کے مابین علمی مباحثوں اور مناظروں کی مجالس بھی خوب گرم ہوئیں۔ اختلافی مسائل پر لکھی جانے والی کتابیں ان دونوں کے متنوع استدلالات سے بھر گئیں۔ لیکن پھر جب (اسلامی) مشرق اور مشرقی ممالک پر تباہی اور بربادی کی آندھی چلی تو اس کے ساتھ ہی یہ سب کچھ ملیامیٹ ہو گیا۔

امام شافعیؒ جب مصر میں آ کر بنی عبدالحکم کے ہاں قیام پذیر ہوئے تو بنی عبدالحکم کی ایک جماعت نے آپ سے استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ اشہب، ابن القاسم اور ابن المواز وغیرہ نے بھی شرف تلمذ حاصل کیا، پھر حارث بن مسکین اور ان کی اولاد نے بھی زانوئے تلمذ تہ کیا۔ لیکن اس کے بعد جب مصر میں رافضیوں کو غلبہ حاصل ہوا تو اہلِ سنت کی فقہ کو زوال آ گیا اور اس کی جگہ فقہِ اہلِ بیت رائج ہو گئی اور بقیہ سب فقہیں نابود ہو گئیں۔ بالآخر جب سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں رافضیوں کی حکومتِ عبیدیین کا خاتمہ ہوا تو یہ صورتِ حال ختم ہوئی اور فقہ شافعی کا پھر دور دورہ ہوا۔ اور عراق اور شام سے اس مذہب کے علماء مصر میں آئے اور ان کی وجہ سے یہ مذہب پہلے سے بھی زیادہ چمکا اور

اس کی خوب گرم بازاری ہوئی۔ ان فقہائے شافعیہ میں علامہ محی الدین نووی کو بہت شہرت حاصل ہوئی جو اس حلقۂ علماء سے تعلق رکھتے تھے جن کی پرورش ملکِ شام میں دولتِ ایوبیہ کے ظلِّ عاطفت میں ہوئی۔ ان کے علاوہ علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے بھی بڑا نام پیدا کیا۔ پھر علامہ ابن الرِّفعَہ اور علامہ تقی الدین ابن دقیق العید نے مصر میں اپنی شہرت کا ڈنکا بجایا۔ پھر ان دونوں کے بعد علامہ تقی الدین سبکی نے اپنی قابلیت کا سکہ جمایا۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ اس زمانہ کے شیخ الاسلام مصر تک پہنچا ہے اور یہ ہیں علامہ سراج الدین بلقینی، جو آج کل مصر کے سب سے بڑے شافعی عالم ہیں اور آپ اس دور کے جلیل القدر علماء میں شمار ہوتے ہیں بلکہ آپ اس عہد کے سب سے بڑے عالم ہیں۔[۵۶]

جب دولتِ ایوبیہ نے دینی مدارس قائم کر کے اور دیگر وسائل کے ذریعہ مذاہب اہلِ سنّت کو مصر میں دوبارہ زندگی بخشی تو اس سلسلہ میں مذہبِ شافعی کی طرف بہت زیادہ توجہ دی اور اس کو اپنی عنایات کا خاص مستحق گردانا۔ چنانچہ حکومت کا سرکاری مذہب ہونے کے ناطے قضاء کا عہدہ اسی کے علماء کے لئے مخصوص رکھا۔

دراصل خانوادۂ ایوبیہ کے افراد سب کے سب شافعی المذہب تھے سوائے سلطانِ شام المعظم عیسیٰ بن العادل ابوبکر کے، جو حنفی مسلک کے پیرو تھے۔ ان سب میں بس وہی اکیلے حنفی تھے اور ان کی وجہ سے ان کی اولاد

---

۵۶ مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۴۴۸ — ۴۴۹۔

بھی حنفی تھی۔[۵۷] یہ اپنے مذہب میں بہت غلو رکھتے تھے، اور احناف ان کو اپنے فقہاء میں شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے کئی جلدوں میں "الجامع الکبیر" کی شرح لکھی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "السہم المصیب فی الرّد علی الخطیب" بھی ہے جس میں انہوں نے خطیب بغدادی کی ان باتوں کا رد کیا ہے جو اس نے اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں امام ابوحنیفہ" کے بارے میں ذکر کی ہیں۔[۵۸]

پھر جب مصر میں دولتِ ایوبیہ کے خاتمہ پر دولتِ ترکیہ بحریہ قائم ہوئی تو اس کے سلاطین بھی سب شافعی المذہب تھے۔[۵۹] لہٰذا عہدۂ قضاء کے سلسلہ میں وہی دستور العمل جاری رہا (جو پہلے تھا)، یہاں تک کہ سلطان ظاہر بیبرس نے بیک وقت چاروں مذاہب کے قاضی مقرر کرنے کا طریقہ جاری کیا۔[۶۰] ان میں سے ہر قاضی کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ قاہرہ اور فسطاط میں اپنے مذہب کے مطابق فیصلے کرے، (ان مقامات پر) وہ اپنے نائب یا ماتحت قاضی مقرر کرے اور پیشکاروں کا تقرر کرے۔ البتہ شافعی قاضی کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ وہ ملک کے بقیہ تمام شہروں میں

---

۵۷ ابن خلکان، ذکر المعظم عیسیٰ بن عادل۔ نیز الفوائد البہیہ ص ۱۵۲۔

۵۸ ابن خلکان وفیات الاعیان، ذکر المعظم عیسیٰ بن العادل۔

۵۹ سلطان بیبرس سے پہلے سلطان سیف الدین قطز بے شک حنفی تھا، لیکن چونکہ اس کا عہدِ حکومت مختصر تھا لہٰذا حکومت کے مذہب پر اس کا کوئی اثر نہ پڑ سکا۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں دعویٰ کیا ہے کہ اس خانوادہ میں اس کے سوا اور کوئی حکمران ایسا نہیں تھا جو شافعی المذہب نہ ہو۔ (حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۰۱)۔ مصنف۔

۶۰ صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۳۴ تا ۳۶ و ۵۴۔

اپنے نائب اور ماتحت قاضی مقرر کر سکتا تھا۔ کسی اور مذہب کا قاضی اس اختیار میں اس کا شریک نہیں تھا۔ اسی طرح وہ تنہا یتیموں کے اموال اور اوقاف کا نگران بھی ہوتا تھا اور قضاۃِ اربعہ میں اس کو پہلا مرتبہ حاصل تھا۔ اس کے بعد مالکی قاضی کا درجہ تھا پھر حنفی کا اور سب سے آخر میں حنبلی قاضی کا۔[۱۱۱]

عدالت کا یہ نظام چرکسیوں کے عہدِ حکومت میں بھی اسی طرح جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب عثمانیوں نے مصر کی حکومت پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے نظامِ عدلیہ کو بدل ڈالا اور قضاۃِ اربعہ کے طریقہ کو ختم کر کے منصبِ قضا صرف حنفیوں کے لئے مخصوص کر دیا کیونکہ یہی ان کا سرکاری مذہب تھا، اور اس وقت سے لے کر ان کے آخری عہد تک یہی سرکاری مذہب رہا۔

لیکن عثمانیوں کے اس طرزِ عمل سے مصر میں شافعی اور مالکی مذہب کی اشاعت میں کوئی فرق نہیں آیا کیونکہ ان دونوں مذاہب کی جڑیں ملک میں پہلے سے مضبوط ہیں اور ان کو قبولِ عام حاصل ہے۔ چنانچہ یہ دونوں مذاہب اس ملک کے شمالی علاقہ (ریف) اور جنوبی علاقہ (صعید) میں غالب رہے۔ ان میں سے شافعی مذہب کے مقلدین

---

[۱۱۱] صبح الاعشیٰ ج ۴ ص ۳۴ تا ۳۶ و ۴۵ ----------------

ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے کہ سلطان الملک الناصر کے عہدِ حکومت میں ان قضاۃ کی ترتیب میں حنفی کو مالکی پر تقدم حاصل تھا پھر جب برہان الدین بن عبدالحق حنفی قاضی کے عہدہ پر فائز ہوئے تو امرائے حکومت نے الملک الناصر کو توجہ دلائی کہ سابق دستور کے مطابق مالکی کو حنفی پر مقدم کیا جائے چنانچہ اس نے امرائے حکومت کے مشورہ کے مطابق ایسا ہی کیا اور پھر ہمیشہ اسی پر عمل جاری رہا۔ (رحلۃ ابن بطوطہ ج ۱ ص ۲۴)۔ (مصنف)

کی تعداد ریف میں زیادہ ہے جو سمندر کی جانب شمالی علاقہ کو کہتے ہیں۔

مصر میں ۱۱۳۳ھ سے ۱۲۸۷ھ تک شیخ الازہر کا عہدہ شافعیوں کے لئے مخصوص رہا۔[۱۱۲] اس عہدہ کا حامل مصر کے علماء کا سربراہ گردانا جاتا ہے۔ پھر ۱۲۸۷ھ میں یہ عہدہ حنفی عالم شیخ محمد المہدی العباسی کو حاصل ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ مفتیٔ اعظم کا عہدہ بھی ان کو ملا۔ پھر ان کے بعد شیخ الازہر کا منصب کسی خاص مذہب کے لئے مخصوص نہیں رہا، لیکن ابھی تک اس منصب پر کوئی حنبلی عالم فائز نہیں ہو سکا ہے کیونکہ مصر میں حنابلہ کی تعداد بہت کم ہے۔

مذہبِ شافعی شام میں:

ملکِ شام میں پہلے مذہبِ اوزاعی کو غلبہ حاصل تھا پھر جب ابو زرعہ محمد بن عثمان دمشقی شافعی مصر کے عہدۂ قضاء سے سبکدوش ہو کر دمشق کے عہدۂ قضاء پر فائز ہوئے تو انہوں نے مذہبِ شافعی کو اس سرزمین میں روشناس کرایا اور اس کے مطابق عدالتی فیصلے کئے۔ ان کے بعد آنے والے قاضیوں نے بھی انہی کی پیروی کی۔ گویا سرزمینِ شام میں مذہبِ شافعی کو لانے والے سب سے پہلے یہی شخص تھے۔ ابو زرعہ کو اپنے مذہب کے

---

[۱۱۲] سب سے پہلے شیخ الازہر کے بارے میں جو معلومات ہم حاصل کر سکے ہیں ان میں اولین نام شیخ محمد الخرشی (متوفی ۱۱۰۱ھ) کا آتا ہے جو مالکی تھے ان کے بعد شیخ ابراہیم بن محمد البرماوی (متوفی ۱۱۰۶ھ) کا نام آتا ہے جو شافعی تھے۔ اس کے بعد یہ عہدہ ۱۱۳۳ھ تک مالکیوں کے لئے مخصوص رہا، پھر شافعیوں کو منتقل ہو گیا۔ (مصنف)

پھیلانے کا اس قدر شوق تھا کہ جو شخص (اس مذہب کی بنیادی کتاب) "مختصر المزنی" زبانی یاد کر لیتا تھا اس کو سو دینار انعام دیتے تھے۔ ان کی وفات سنہ ۲۶۳ھ یا سنہ ۲۶۴ھ میں ہوئی۔[163]

مقدسی نے اپنی کتاب "احسن التقاسیم" میں لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں یعنی چوتھی صدی ہجری میں ملک شام میں سب فقہاء شافعی المذہب تھے۔ وہ کہتا ہے "یہاں نہ کوئی مالکی مذہب کا فقیہ نظر آتا ہے اور نہ داؤدی (ظاہری) مذہب کا۔"

مذہب شافعی ترکستان، ایران اور عراق میں:

سبکی کی "طبقات" اور سخاوی کی "الاعلان بالتوبیخ" میں ہے کہ یہ مذہب ماوراء النہر میں محمد بن علی بن اسمٰعیل القفال الکبیر الشاشی (متوفی ۳۶۵ھ) کے ذریعہ پھیلا۔[164]

مقدسی لکھتا ہے کہ (چوتھی صدی ہجری میں) اقلیم مشرق کے اکثر شہروں مثلاً کورۃ الشاش، ایلاق، طوس، نسا اور ابیورد وغیرہ میں یہ مذہب چھایا ہوا تھا۔[165] اور ہرات، سجستان، سرخس، نیشاپور اور مرو وغیرہ میں بھی یہ مذہب پھیلا ہوا تھا لیکن ہرات، سجستان اور سرخس

---

[163] رفع الاصر۔ ص ۱۸۱۔ الاعلان بالتوبیخ۔ ص ۱۲۸۔ الثغر البسام فی قضاۃ الشام لابن طولون۔ ص ۳۶۔

[164] طبقات السبکی۔ ج ۲ ص ۱۷۶۔ الاعلان بالتوبیخ۔ ص ۹۹۔

[165] المقدسی، احسن التقاسیم۔ ص ۳۲۳۔

میں شوافع اور احناف کے مابین بہت سخت تعصبات پائے جاتے تھے اور بسا اوقات ان متعصبانہ جذبات کے نتیجہ میں خون خرابہ بھی ہو جاتا تھا جس کو روکنے کے لئے سلطان کو مداخلت کرنی پڑتی تھی۔[166]

پھر وہ اقلیم دیلم کے بارے میں لکھتا ہے کہ قومس کے (سب) باشندے اور اکثر اہل جرجان اور طبرستان کے بعض باشندے حنفی المذہب تھے۔ ان علاقوں کے غیر احناف باشندوں میں کچھ لوگ حنبلی تھے اور کچھ شافعی۔ لیکن جیلان میں شافعیوں کے علاوہ کوئی دوسرا اہل حدیث نظر نہیں آتا تھا۔[167]

اقلیم آقور کے بارے میں وہ لکھتا ہے (جس میں موصل اور آمد وغیرہ شامل ہیں) کہ یہاں حنفی اور شافعی دونوں پائے جاتے تھے۔ کچھ حنابلہ بھی ملتے تھے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اقلیم کرمان میں شوافع کی اکثریت تھی۔[168]

سخاوی کی "الاعلان بالتوبیخ" میں ہے کہ مرو اور خراسان میں شافعی مذہب کی اشاعت احمد بن سیار (متوفی ۲۶۸ھ) کے بعد عبدان بن محمد بن عیسیٰ المروزی نے کی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ احمد بن سیار شافعی مذہب کی بہت سی کتابیں لے کر مرو پہنچا۔ لوگوں نے ان کتابوں کو بہت پسند کیا۔ عبدان نے بھی ان میں سے چند کتابیں دیکھیں اور انہیں اپنے لئے نقل کرنا چاہا۔ لیکن ابن سیار نے نقل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

---

[166] المقدسی، احسن التقاسیم۔ ص ۳۲۳

[167] احسن التقاسیم۔ ص ۳۶۵

[168] ایضاً۔ ص ۳۹۸

اس پر عبدان نے اپنی زمین اور جائیداد بیچی اور (ان کتابوں کے حصول کے لیے) مصر چلے گئے۔ وہاں امام شافعی کے اصحاب ربیع وغیرہ سے ملاقات کی اور (ان سے) امام شافعیؒ کی کتابوں کی نقلیں حاصل کر کے مرو واپس آ گئے۔ ابن سیار اس وقت تک زندہ تھے۔ (اس کے بعد عبدان مذہب شافعی کی اشاعت میں لگ گئے یہاں تک کہ) ۲۹۳ھ میں ان کی وفات ہو گئی۔[۱۱۹]

سخاوی نے آگے یہ بھی لکھا ہے کہ ابو عوانہ یعقوب بن اسحٰق نیشاپوری اسفرائینی جو "الصحیح المستخرج علی مسلم" کے مصنف ہیں پہلے شخص ہیں جنہوں نے امام شافعیؒ کے مذہب اور ان کی تصانیف کو اسفرائین میں روشناس کرایا۔ انہوں نے ربیع اور مزنی سے علم حاصل کیا تھا۔ ۳۱۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

آگے چل کر سخاوی یہ بھی لکھتا ہے کہ ابو اسمٰعیل محمد بن اسمٰعیل بن یوسف السلمی الترمذی امام شافعیؒ کی کتابیں مصر سے باہر لے کر گئے، انہیں سے اسحٰق بن راہویہ نے نقلیں حاصل کیں اور انہی کتابوں کی بنیاد پر اپنی "الجامع الکبیر" تصنیف کی۔ انہوں نے بویطی سے روایت کی سند حاصل کی تھی۔ ۲۳۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔[۱۲۰]

سخاوی کا بیان ہے کہ بیشتر ممالک میں امام شافعیؒ کا مذہب ابن سریج کی سند سے پھیلا ہے۔[۱۲۱]

یاقوت نے "معجم البلدان" میں بیان کیا ہے کہ

---

۱۱۹ الاعلان بالتوبیخ۔ ص ۱۲۸

۱۲۰ ایضاً۔ ص ۱۲۹

۱۲۱ ایضاً۔

"باشندگان رے کے تین طبقے تھے۔ اوّل شافعی جن کی تعداد بہت کم تھی۔ دوم احناف جو تعداد میں زیادہ تھے اور سوم شیعہ جو سواد اعظم تھے۔ پہلے تو سنیوں اور شیعوں میں منافرت پیدا ہوئی، اس معاملہ میں احناف اور شوافع باہم مل گئے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے لگے۔ ان گروہوں میں جنگ و جدل بڑھا تو دونوں نے مل کر شیعوں کا خاتمہ کر دیا۔ پھر جب شیعہ باقی نہ رہے تو حنفیوں اور شافعیوں میں عصبیت اور منافرت پیدا ہو گئی۔ بالآخر شوافع اقلیت میں ہونے کے باوجود فتحمند ہوئے۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ شیعوں اور حنفیوں کے محلے تو ویران و برباد ہو گئے، البتہ شوافع کا چھوٹا سا محلہ باقی ہے، کیونکہ وہ پہلے ہی کم تعداد میں تھے۔ اب وہاں صرف وہی شیعہ اور حنفی باقی رہ گئے ہیں جو اپنے مذہب کو مخفی رکھتے ہیں۔"[۱۲۲]

پھر وہ رے اور ہمذان کے مابین ساوہ کے علاقہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ وہاں کے سب باشندے سنی شافعی تھے۔ اسی کے قریب ایک دوسرا شہر "آوہ" آباد تھا۔ اس کے تمام باشندے شیعہ امامیہ تھے۔ باہم قریب ہونے کی وجہ سے ان دونوں شہروں کے مختلف العقائد لوگوں میں مذہبی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔[۱۲۳]

ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل میں ۵۹۵ھ کے واقعات بیان کرتے

---

۱۲۲ معجم البلدان ج ۲۔ ص ۸۹۳ و ۸۹۴

۱۲۳ ایضاً ج ۳۔ ص ۲۴

ہوئے لکھا ہے کہ ”اسی سال میں سلطانِ غزنہ غیاث الدین بن سام اور بعض باشندگانِ خراسان نے مذہبِ کرامیہ کو ترک کر کے مذہبِ شافعی اختیار کرلیا۔“

اس کا سبب یہ ہوا کہ سلطان غیاث الدین کی مصاحبت میں فخر مبارک شاہ نامی ایک شخص تھا جو فارسی میں شعر کہنے کے علاوہ بہت سے دیگر علوم میں بھی ماہر تھا۔ اس نے مذہبِ شافعی کے فقیہ شیخ وجیہ الدین ابوالفتح محمد بن محمود المروزی کو غیاث الدین کی خدمت میں پیش کیا جنہوں نے اس کے سامنے مذہبِ شافعی کی خوبیاں اور محاسن بیان کئے اور مذہبِ کرامیہ کی خامیاں اور نقائص ظاہر کئے۔ یہ باتیں سن کر غیاث الدین نے شافعی مذہب قبول کرلیا اور شوافع کے لئے مدارس قائم کئے اور غزنہ میں ان کے لئے ایک مسجد بھی بنائی۔ اس کے علاوہ ان کو بہت سی مراعات دیں۔ یہ دیکھ کر کرامیوں نے شیخ وجیہ الدین کو تکلیف دینے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔

یہ مذہب محمد بن کرام سجستانی (متوفی ۲۵۵ھ) کی طرف منسوب ہے۔ لفظ ”کرام“ کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ ”کِرام“ کہتے ہیں اور بعض ”کَرام“ اور بعض تشدید کے ساتھ ”کرّام“ بھی کہتے ہیں۔ محمد بن کرام ایک معروف کلامی مذہب کے بانی ہیں۔ لیکن مقریزی نے اپنی ”خطط“ (ج ۲ ص ۳۴۹) میں یہ بھی لکھا ہے کہ فقہ کے بعض مسائل میں بھی وہ منفرد رائے رکھتے تھے مثلاً وہ مسافر کے لئے صلوٰۃ میں صرف دو تکبیریں کافی سمجھتے تھے اسی طرح ان کے نزدیک ایک نجاست آلودہ کپڑے میں نماز ہو جائے گی، وہ اس کے بھی قائل تھے کہ عبادات کے صحیح ہونے کے لئے نیت ضروری نہیں ہے صرف اسلام کی نیت یعنی مسلمان ہونا کافی ہے۔ اسی طرح کے چند اور مسائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقہ میں بھی صاحبِ مذہب ہیں۔ اور اسی حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد غیاث الدین کے مذہب کرامیہ چھوڑ کر مذہبِ شافعی اختیار کرنے کا مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ (مصنف)

کامل ابن اثیر ج ۱۲ ص ۶۴ و ۶۵ — ایضاً

سلطان غیاث الدین کے مذہبِ شافعی قبول کرنے کی ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جب غیاث الدین اور اس کے بھائی شہاب الدین (ابن سام غوری) خراسان پر قابض ہوئے تو وہاں ان دونوں سے کہا گیا کہ تمام شہروں کے لوگ مذہبِ کرامیہ کے ماننے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ حقیر سمجھتے ہیں، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اس مذہب کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ سن کر ان دونوں نے شافعی مذہب قبول کرلیا۔ لیکن اس کے بھائی شہاب الدین (غوری) کے بارے میں ایک روایت یہ آتی ہے کہ وہ حنفی المذہب تھا۔ خدا جانے اصل واقعہ کیا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں بغداد میں حنفی مذہب غالب تھا پھر مذہبِ شافعی وہاں پہنچا تو حنفی مذہب سے اس کی کشمکش شروع ہو گئی۔ وہاں اگرچہ احناف کی کثرت تھی اور حکومت کا مذہب بھی حنفی تھا لیکن پھر بھی بعض عباسی خلفاء نے مذہبِ شافعی قبول کرلیا جیسا کہ خلیفہ متوکل نے کیا۔ اور ان میں متوکل سب سے پہلا خلیفہ ہے جس نے مذہبِ شافعی کی پیروی کی۔

بغداد میں مذہبِ شافعی کو پھیلانے والوں میں حسن بن محمد زعفرانی کا نام بھی آتا ہے جو امام شافعیؒ کے قدیم رواۃ میں سے ہیں۔ ۲۶۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

سخاوی اپنی کتاب ”الاعلان بالتوبیخ“ میں لکھتا ہے:

”ربیع بن سلیمان نے ۲۴۰ھ میں حج کیا۔ اس وقت ان کی عمر میں

محاضرۃ الاوائل۔ ص ۵۸

طبقات السبکی۔ ج ۱۔ ص ۲۵۰ و ۲۵۱

ابو علی الحسن بن محمد زعفرانی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ اس کے بعد ربیع نے کہا: "ابو علی! تم مشرق میں ہو اور میں مغرب میں۔ ہم دونوں (اپنی اپنی جگہ) اس علم یعنی فقہِ شافعی کو پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں۔"[۲۹]

یہاں مغرب سے ربیعؒ کی مراد مصر ہے کہ وہ بغداد کے لحاظ سے مغرب کی جانب پڑتا ہے۔

تاج الدین سبکیؒ کی "طبقات" میں ہے کہ "بنوابی عقامہ ہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تہامہ میں مذہبِ شافعی کی اشاعت کی"[۳۰] مصر اور تمام بلادِ مشرق میں اس مذہب (شافعی) کے فروغ پانے کے بارے میں یہی معلومات ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں۔

مذہبِ شافعی مغرب (شمالی افریقہ) میں:

بلادِ مغرب کا جہاں تک تعلق ہے وہاں مالکیوں کے غلبہ کی وجہ سے شافعی مذہب فروغ نہ پاسکا۔ چنانچہ مقدسی نے اپنی "احسن التقاسیم" میں یہاں تک لکھا ہے کہ اس کے زمانہ میں تمام بلادِ مغرب میں (مراکش سے لے کر) حدودِ مصر تک شافعی مذہب کو کوئی نہیں جانتا۔ وہاں یہ مذہب اتنا غیر معروف ہے کہ ایک مرتبہ کسی فقہی مسئلہ پر بحث و مذاکرہ کے دوران اس نے بعض مغربی علماء کے سامنے امام شافعی کا قول بیان کیا تو وہ حیران

---

[۲۹] الاعلان بالتوبیخ۔ ص ۱۲۹

[۳۰] طبقات السبکی، ج ۴۔ ص ۲۳۷

ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ شافعی کون ہیں؟ مشرق میں تو امام ابوحنیفہؒ ہیں اور ہمارے مغرب میں امام مالکؒ ہیں۔[۳۱]

مقدسی آگے لکھتا ہے کہ "میں نے دیکھا ہے کہ مالکی مذہب کے پیرو امام شافعیؒ سے انتہائی بغض رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے تو امام شافعیؒ نے امام مالکؒ سے علم حاصل کیا۔ پھر انہی سے اختلاف کرنے لگے۔"[۳۲]

پھر وہ قیروان کے بارے میں کہتا ہے کہ وہاں صرف حنفی اور مالکی مذہب کے لوگ ہیں اور دونوں میں حیرت انگیز طور پر اُلفت و محبت پائی جاتی ہے۔ ان میں نہ کبھی کوئی جھگڑا ہوتا ہے اور نہ تعصب پایا جاتا ہے۔[۳۳]

آگے وہ اندلس کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہاں صرف مالکی مذہب کے لوگ ہیں، کسی اور مذہب کے مقلد بالکل نہیں ملتے۔ اور اگر وہ کسی حنفی یا شافعی کو وہاں دیکھ لیتے ہیں تو اس کو فوراً ملک بدر کر دیتے ہیں۔[۳۴]

ابن اثیر کی "الکامل" میں ہے کہ "سلطانِ مغرب و اندلس یعقوب بن یوسف بن عبدالمومن نے پہلے تو اپنے ظاہری مذہب کا اعلان کیا تھا، لیکن پھر اپنے آخری دور میں مذہبِ شافعی کی طرف مائل ہو گیا تھا، اور اس نے اپنی قلمرو کے بعض شہروں میں اسی مذہب (شافعی) کے قاضیوں کو مقرر کیا تھا۔"[۳۵]

---

[۳۱] احسن التقاسیم۔ ص ۲۳۶۔

[۳۲] ایضاً

[۳۳] ایضاً

[۳۴] ایضاً

[۳۵] الکامل لابن اثیر۔ ج ۱۱۔ ص ۱۱۸۔

مذہبِ شافعی اور مذاہبِ متکلمین:

اکثر شوافع عقائد میں امام ابوالحسن الاشعری کے پیرو ہیں۔ تاج الدین سبکی اپنی "طبقات" میں لکھتے ہیں:

"شافعی مذہب کے مقلدوں کی اکثریت اشعری ہوتی ہے، البتہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو تجسیم یا اعتزال کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں[۱۳]۔"

---

[۱۳] طبقات السبکی۔ ج ۲۔ ص ۲۶۱۔

مترجم کہتا ہے[*] آج کل یعنی پندرہویں صدی ہجری کے آغاز میں شافعی مذہب کے پیرو اکثر انڈونیشیا، ملائیشیا، فلپائن، تھائی لینڈ، سری لنکا، مصر، سوڈان، اردن، لیبیا، فلسطین اور لبنان میں آباد ہیں۔ جزوی طور پر یہ شمالی افریقہ کے دیگر ممالک، برصغیر ہند کے ساحلی علاقوں، سعودی عرب، عراق و شام اور یمن میں بھی آباد ہیں۔ ۱۴۰۳ھ میں شوافع کی دنیا میں تعداد کا اندازہ دس کروڑ لگایا گیا تھا۔[*] ۱۲ (معراج محمد)

مذہبِ حنبلی

مذہبِ حنبلی کا آغاز

مذہبِ حنبلی امام احمد بن حنبل شیبانی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے جن کی ولادت ۱۶۴ھ میں بغداد میں ہوئی اور وہیں ۲۴۱ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ آپ کی ولادت کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ آپ مرو میں پیدا ہوئے اور شیرخوارگی کی عمر میں ہی بغداد لائے گئے۔ آپ امام شافعیؒ کے خاص الخاص تلامذہ میں سے تھے اور اُن کی مصر کو روانگی کے وقت رخصت کرنے والے خاص اصحاب میں شامل تھے۔

جمہور سنی مسلمان جن فقہی مذاہب پر عمل کرتے ہیں ان میں یہ چوتھا مذہب ہے۔ اس کا ظہور سب سے پہلے بغداد میں ہوا اور پھر وہیں سے یہ دیگر علاقوں میں پھیلا۔ لیکن بقیہ تین مذاہب کے مقابلہ میں اس کو بہت کم فروغ حاصل ہو سکا[۱]۔

ابن فرحون اپنی کتاب "الدیباج" میں کہتا ہے: "امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب کا ظہور سب سے پہلے بغداد میں ہوا، پھر یہ ملکِ شام کے بہت سے شہروں میں پھیلا، لیکن اب (یعنی آٹھویں صدی ہجری) یہ کمزور پڑ گیا ہے[۲]۔"

---

[۱] الفوائد البھیہ۔ ص ۶

[۲] الدیباج۔ ص ۱۳

علامہ ابن خلدون اپنے "مقدمہ" میں لکھتے ہیں:

"امام احمد بن حنبلؒ کے مقلدین بہت کم تعداد میں ہیں کیونکہ ان کا مذہب اجتہاد سے دُور ہے، اور اس کا اعتماد و انحصار زیادہ تر ان اخبار و روایات (احادیث) پر ہے جو ایک دوسرے کی تائید و توثیق کرتی ہیں۔ اس مذہب کے مقلدین کی اکثریت شام اور عراق میں بستی ہے خصوصاً بغداد اور اس کے گرد و نواح میں۔ یہ لوگ دوسروں کی بہ نسبت سنّت (نبوی) کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور روایتِ حدیث میں مشغول رہتے ہیں۔"[۳]

مذہبِ حنبلی مصر میں:

جہاں تک مصر کا تعلق ہے وہاں یہ مذہب بہت مدت کے بعد پھیلا۔ وہاں یہ واضح طور پر ساتویں صدی ہجری میں ظاہر ہوا۔ علامہ سیوطیؒ اس تاخیر کی توجیہ کرتے ہوئے "حسن المحاضرہ" میں کہتے ہیں:

"یہ لوگ (حنابلہ) دیارِ مصر میں بہت کم تعداد میں ہیں چنانچہ وہاں کی تاریخ میں اس مذہب کا ذکر ساتویں صدی اور اس کے بعد کے حالات میں ملتا ہے، اس سے پہلے وہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد رضی اللہ عنہ تیسری صدی میں گزرے ہیں۔ اور ان کا مذہب چوتھی صدی سے پہلے عراق سے باہر نہیں نکلا۔ اور یہ

[۳] مقدمہ ابن خلدون۔ ص ۴۴۸

چوتھی صدی کا زمانہ وہ ہے جبکہ مصر پر عبیدیین (فاطمی) مسلط تھے۔ اور انہوں نے وہاں تینوں (سنّی) مذاہب کے ائمہ کا خاتمہ کر دیا تھا، کسی کو قتل کیا، کسی کو جلاوطن کیا اور کسی کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا۔ اور وہاں صرف اپنے مذہب رفض و شیعہ کو جاری و نافذ کیا۔ ان کی حکومت کو چھٹی صدی کے آخر میں زوال آیا۔ اور اس کے بعد ہی سُنّی مذاہب کے ائمہ مصر میں واپس آسکے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے سب سے پہلے حنبلی امام جو مصر میں وارد ہوئے وہ "عمدۃ الاحکام" کے مصنف حافظ عبد الغنی مقدسی ہیں۔"[۴]

مقریزی نے اپنی "خطط" میں لکھا ہے، "مصر میں عہد ایوبیہ میں حنبلی مذہب اور حنفی مذہب کا کچھ زیادہ ذکر نہیں آتا۔ اس مذہب (حنبلی) کو مصر میں دولت ایوبیہ کے آخری دور میں فروغ حاصل ہوا"[۵]

پھر جیسا کہ "السبل الوابلہ" میں مذکور ہے، قاضی عبد اللہ بن محمد بن محمد عبد الملک الحجاوی کے زمانہ میں جو ۷۲۸ھ میں مصر میں مذہبِ حنبلی کے عہدۂ قضاء پر فائز تھے اور ۷۶۹ھ میں وفات پائی، اس مذہب کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔[۶]

[۴] حسن المحاضرۃ للسیوطی۔ وحلیۃ الکمیت، ج ۱۔ ص ۲۲۲۔ (حافظ عبد الغنی المقدسی نے ۶۰۰ھ میں مصر میں وفات پائی اور وہ ۵۹۵ھ کے لگ بھگ مصر میں آئے تھے۔ مترجم محمد)۔

[۵] مقریزی، الخطط۔ ج ۲۔ ص ۳۴۳۔

[۶] السبل الوابلہ علی ضرائح الحنابلہ (جو طبقاتِ حنابلہ پر ہے)۔ ص ۱۰

مذہبِ حنبلی دیگر ممالک میں:

مقدسی کا بیان ہے کہ "یہ مذہب چوتھی صدی ہجری میں بصرہ، اقلیم آقور (یعنی موصل و رقہ کا علاقہ)، دیلم (یعنی بحرِ کیسپین کا جنوبی ساحلی علاقہ) رحاب (یعنی آذربیجان اور آرمینیا کا علاقہ) اور اقلیم خوزستان کے شہر سوس میں موجود تھا، اور بغداد میں اس کو اور مذہب شیعہ کو غلبہ حاصل تھا۔[56]

اسی سلسلہ میں وہ مصر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس زمانہ میں مصر میں فتوے مذہبِ فاطمی کے مطابق دیئے جاتے تھے، البتہ دیگر تمام مذاہب بھی شہر فسطاط میں کھلے عام موجود تھے۔ چنانچہ وہاں کرامیوں کا ایک محلہ تھا، اور ایک ایک کوچہ معتزلہ اور حنابلہ کا بھی موجود تھا۔"[57]

راقم الحروف کہتا ہے کہ اس مذہب کی اشاعت متعدد شہروں میں خواہ کتنی بھی ہوئی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے مقلدین کی تعداد ہر زمانہ میں کم رہی ہے، اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خفاجی نے اپنی کتاب "الریحانہ" میں علامہ زین الدین محمد انصاری خزرجی کے تذکرہ میں لکھا ہے، "انہوں نے امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں تفقہ حاصل کیا۔ چنانچہ یہ اپنے تلامذہ (کی علمی پیاس بجھانے) کے لئے ایک شیریں چشمہ تھے۔ ع وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشَقُونَ مَذَاهِبُ (لوگوں کی پسند کے مطابق ان کے الگ الگ مذہب اور طریقے ہیں)۔ . .

[56] احسن التقاسیم۔ ص ۱۱۲ و ۱۱۳ و ۱۲۶، ۲۸۰، ۲۹۱، ۳۱۸ (جدید ایڈیشن مطبع بیروت ۱۹۸۷ء)

[57] ایضاً۔ ص ۱۷۳

درحقیقت حنابلہ ہر زمانہ میں نہایت قلیل تعداد میں رہے، اور معزز بن ہمیشہ اسی طرح رہے ہیں، جیسا کہ کسی نے ان کے بارے میں کہا ہے[58]

يَقُولُونَ لِي قَدْ قَلَّ مَذْهَبُ أَحْمَدٍ — لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ "امام احمد کا مذہب (ماننے والے)
وَكُلُّ قَلِيلٍ فِي الْأَنَامِ ضَئِيلُ — کم ہیں اور جو بھی (تعداد میں) کم ہوتا ہے وہ لوگوں میں حقیر ہوتا ہے" اس پر میں نے ان لوگوں سے کہا کہ کیا
فَقُلْتُ لَهُمْ: مَهْلًا غَلِطْتُمْ بِزَعْمِكُمْ — ٹھہرو اور اصل تم نے اپنے اس گمان میں غلطی کی ہے۔ کیا تم
أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ الْكِرَامَ قَلِيلُ — نہیں جانتے کہ شرفاء (ہمیشہ) کم ہوا کرتے ہیں۔
اگر ہم تھوڑے ہیں تو کوئی حرج نہیں، ہمارے پڑوسی
وَمَا ضَرَّنَا أَنَّا قَلِيلٌ وَجَارُنَا — تو غالب ہیں، اور اکثر لوگوں کے (یا اکثریت رکھنے والوں کے)
عَزِيزٌ وَجَارُ الْأَكْثَرِينَ ذَلِيلُ[59] — پڑوسی ذلیل ہوتے ہیں۔"

ہم نے نہیں سنا کہ یہ مذہب کسی علاقہ میں غالب یا حاکم رہا ہو سوائے اس کے کہ آج کل بلادِ نجد میں اس کو غلبہ حاصل ہے،[60] نیز بغداد

[58] ریحانۃ الالباء۔ ص ۲۸۹۔ (نیا ایڈیشن ۱۳۸۶ھ جلد ثانی ص ۱۹۳)

[60] اس مذہب کی تجدید و نشاۃ ثانیہ پہلے آٹھویں صدی ہجری میں امام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم وغیرہ کے ذریعہ ہوئی اس کے بعد بارہویں صدی ہجری میں نجد کے شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اپنی اصلاحی تحریک کے ذریعہ حنبلی مذہب کی تجدید اور اشاعت میں نمایاں کام کیا۔ ان کو حکومتِ سعودی عرب کے بانی جلالۃ الملک عبدالعزیز آل سعود کی پشت پناہی حاصل ہوئی اور ان کے عہدِ حکومت میں اس مذہب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ آجکل مملکتِ عربیہ سعودیہ کا یہی سرکاری مذہب ہے اور جزیرۃ العرب کے دیگر علاقوں میں بھی اس مذہب کے پیرو پائے جاتے ہیں۔ اور فلسطین اور شام اور عراق وغیرہ میں بھی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اس مذہب کے متبعین کی تعداد کا اندازہ تیس چالیس لاکھ کے درمیان لگایا گیا تھا۔ ۳۰ (مترجم)

یں بھی چوتھی صدی میں اس کو تسلط حاصل تھا، خصوصاً ۳۲۳ھ کے
لگ بھگ اس کا وہاں بڑا زور تھا۔

ابن اثیر اپنی تاریخ الکامل میں اس سن (۳۲۳ھ) کے واقعات
بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اس سال (بغداد میں) حنابلہ نے بڑی طاقت پکڑ لی اور ان کو
اس قدر اقتدار حاصل ہو گیا کہ وہ فوجی افسروں اور عام لوگوں کے
گھروں پر چھاپے مارتے، اگر وہاں نبیذ نظر آتی تو اس کو بہا دیتے،
کوئی گانے والی مل جاتی تو اس کو مارتے اور آلاتِ موسیقی کو توڑ ڈالتے۔
خرید و فروخت کے معاملات میں دخل دیتے اور اعتراضات کرتے،
مردوں کو عورتوں اور لڑکوں کے ساتھ چلنے سے روکتے۔ اور ان
کے متعلق تحقیق کرتے کہ ان کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اگر کوئی بتانے
سے گریز کرتا تو اس کو مارتے پیٹتے اور پولیس کے پاس لا کر اس پر
حیاسوزی کا الزام لگاتے۔"

وہ لکھتا ہے کہ "ان کی ان احتسابی کارروائیوں سے بغداد میں
بڑا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ بالآخر بغداد کے کوتوال بدر الدین خرشنی کو ان
کے خلاف کارروائی کرنی پڑی اور ۱۰ جمادی الآخرہ کو اس نے ابو محمد
بربہاری حنبلی کے تلامذہ کے سامنے اعلان کرا دیا کہ کوئی دو حنبلی
باہم جمع نہ ہوں اور نہ کوئی مذہبی مناظرہ کریں۔"

ابن اثیر کہتا ہے کہ "کوتوال کے اس اعلان کا کوئی فائدہ نہیں ہوا
بلکہ ان کا فتنہ و فساد اور بڑھ گیا۔ انہوں نے ایک ترکیب یہ کی کہ
مسجدوں میں رہنے والے اندھوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ جب بھی

کوئی شافعی ان کے قریب سے گزرتا یہ ان اندھوں کو بھڑکا کر اس کے پیچھے لگا
دیتے۔ وہ اس کو اپنے ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے مار مار کر ادھ موا کر
دیتے۔ اس سے بہت سے شوافع کی جانیں ضائع ہوئیں۔ یہ صورتحال
دیکھ کر خلیفہ راضی باللہ نے ان کے خلاف نہایت سخت فرمان جاری
کیا جس میں حنابلہ کی سرگرمیوں کی مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ اگر وہ اپنی
ان مذہبی سخت گیریوں سے باز نہ آئیں گے تو ان کو پوری پوری سزا
دی جائے گی اور بے دریغ ان کا استیصال کیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ"[11]

درحقیقت اس قسم کے فتنے کھڑے کرنا ان کے عوام کے تعصب
اور شر پسندی کا نتیجہ تھا، اور اکثر ان کا تعلق ایسے اعتقادی امور سے
تھا جن سے دوسرے لوگ اختلاف رکھتے تھے، کیونکہ عقائد میں حنابلہ
کے چند مخصوص نظریات ہیں۔

مذہبِ حنبلی اور مذاہبِ متکلمین:

تاج الدین سبکی نے اپنی "طبقات" میں لکھا ہے کہ حنابلہ کے
متقدمین میں سے اکثر علماء اشعری تھے، ان میں سے کوئی اشعری عقیدہ سے
خارج نہیں ہوا سوائے ان لوگوں کے جو اہلِ تجسیم سے جا ملے۔[12]

سبکی نے آگے لکھا ہے کہ "دیگر مذاہبِ ثلٰثہ کی بہ نسبت حنابلہ
میں اہلِ تجسیم سب سے زیادہ ملتے ہیں۔"[13]

---

[11] ابن الاثیر۔ الکامل۔ ج ۸۔ ص ۲۲۹، ۲۳۰ (طبع یورپ)

[12] طبقات السبکی، ج ۲۔ ص ۲۶۱

[13] ایضاً۔

خاتمۂ کلام

الغرض ان مذکورہ بالا مذاہب اربعہ کو وقت کے ساتھ ساتھ فروغ حاصل ہوتا گیا اور اہلِ سنّت کے بقیہ مذاہب مٹتے گئے، یہاں تک کہ جب ساتویں صدی ہجری آئی تو پوری اسلامی دنیا میں انہی چار مذاہب کو غلبہ حاصل ہو گیا اور سب جگہ یہی چھا گئے اور فقہائے اسلام نے بھی انہی مذاہبِ اربعہ میں سے کسی ایک کا اتباع ضروری قرار دے دیا۔ لہٰذا ان کے سوا بقیہ تمام سُنّی مذاہب فنا ہو گئے سوائے ایک ظاہری مذہب کے، جو بعض ممالک میں آٹھویں صدی ہجری تک قائم رہا، لیکن بالآخر وہ بھی ختم ہو گیا، جیسا کہ ہم اوپر تفصیلاً بیان کر چکے ہیں۔

چنانچہ مقریزی کہتا ہے کہ

"جب سلطان ظاہر بیبرس بُندُقداری کا دورِ حکومت آیا تو اس نے مصر[1] اور قاہرہ میں چار قاضی مقرر کئے جو شافعی، مالکی، حنفی اور حنبلی تھے۔ یہ سلسلہ ۶۶۵ھ سے برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ تمام عالمِ اسلام میں ان مذاہب

[1] یہاں مصر سے مراد شہر فسطاط ہے جو اس زمانہ میں قاہرہ سے الگ تھا پھر بعد میں دونوں مل کر ایک ہو گئے اور فسطاط قاہرہ کا ایک حصہ کہلانے لگا۔ آج کل اس کو مصرِ قدیمہ کہا جاتا ہے۔ (مصنّف)

اربعہ کے سوا کوئی فقہی مذہب ایسا باقی نہ رہا جو اہلِ اسلام کا مذہب گردانا جاتا ہو (گویا صرف یہی چار مذہب اسلامی فقہی مذاہب کہلانے لگے)۔ اور اسی طرح مذاہب متکلمین میں سے صرف مذہب اشعری باقی رہ گیا۔ اب انہیں مذاہب کے لئے تمام اسلامی ممالک میں مدارس خانقاہیں، زاویے، رباط اور تکیے قائم کئے جانے لگے۔ اور اگر کوئی شخص ان کے سوا کسی دوسرے مذہب کا اتباع کرنا چاہتا تو اس پر تنقید کی جاتی اور اس کو انہی چار مذاہب میں سے کسی ایک کی تقلید پر مجبور کیا جاتا جب تک کوئی شخص ان چار مذاہب میں سے کسی ایک کا مقلد نہ ہوتا اس کو نہ تو قاضی (جج) مقرر کیا جاتا اور نہ اس کی گواہی قبول کی جاتی، نہ اس کو کسی مسجد کی امامت و خطابت ملتی، اور نہ وہ کسی مدرسہ کا استاد مقرر ہوتا۔ اس زمانہ میں ان تمام ممالک کے فقہاء نے ان چار مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید کو واجب قرار دے دیا اور ان کے سوا کسی بھی دوسرے مذہب کے اتباع کو حرام قرار دے دیا۔ اس وقت سے اب تک اسی فتوے پر عمل درآمد ہے۔[۱]

یہاں مذاہب "اہلِ اسلام" سے مقریزی کی مراد "جمہور مسلمین" کے مذاہب ہیں، ورنہ مذہب اباضیہ اس وقت بھی موجود تھا اور آج

---

[۱] المقریزی "خطط" ج ۲ ص ۳۴۳ و ۳۴۴

بھی مشرق و مغرب کے بعض شہروں میں اس پر عمل جاری ہے۔ اسی طرح شیعہ فقہ کے متبعین بھی ایران اور دوسرے ملکوں میں پہلے بھی موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں۔

نیز مقریزی نے جو "اشعری مذہب" کے بارے میں لکھا ہے کہ عقائد میں صرف وہی ایک مذہب رہ گیا ہے، یہ بھی محلِ نظر ہے، کیونکہ احناف اصول و عقائد میں "ماتریدی مذہب" کے پیرو ہیں۔ البتہ ان کو اس لحاظ سے اشعریوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جن معنوں میں تاج الدین سبکی نے شمار کیا ہے جس کی تفصیل اوپر بیان کی جاچکی ہے۔ اس کے علاوہ مقریزی نے حنابلہ کو شاید ان کی قلیل تعداد کے پیش نظر قابلِ ذکر نہیں سمجھا ورنہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آتے ہیں عقائد کے باب میں ان کے چند مخصوص نظریات ہیں۔

فقہی مذاہب کی موجودہ صورتِ حال:

اب ہم اس بحث کے آخر میں ان اسلامی فقہی مذاہب کی وہ صورتِ حال بیان کریں گے جو موجودہ دور میں اسلامی دنیا میں پائی جاتی ہے۔ اس سے قارئین کو معلوم ہوگا کہ آج کل یہ مذاہب اربعہ بلادِ اسلامی کے کن کن علاقوں میں موجود ہیں اور وہاں ان کا کیا تناسب ہے۔ لیکن واضح رہے کہ ہمارے اس جدید دور کے جائزہ کا ماخذ زیادہ تر یوروپی مستشرقین کی کتابیں اور ان کی تحقیقات ہیں۔ کیونکہ عربی زبان میں اس دور کے متعلق معلومات

بہت کم ملتی ہیں۔[31]

آج کل مغربِ اقصیٰ (مراکش وغیرہ) میں مذہب مالکی کو غلبہ حاصل ہے۔ اسی طرح الجزائر، تونس اور طرابلس (لیبیا) میں بھی وہی چھایا ہوا ہے۔ ان تمام ممالک میں مالکیوں کے سوا کسی دوسرے مذہب کا مقلد نظر نہیں آتا، البتہ صرف حنفی بہت تھوڑی تعداد میں ملتے ہیں جو در حقیقت عثمانی ترک خاندانوں کے آثار باقیہ ہیں۔ یہ بھی زیادہ تر تونس میں ہیں جن میں سے چند افراد شاہی خاندان سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے دارالحکومت میں مالکی قاضی کے ساتھ ساتھ حنفی قاضی بھی نظر آتا ہے۔ لیکن ملک کے بقیہ تمام حصوں کے قضاۃ مالکی المذہب ہیں۔ دارالحکومت میں دو قاضیوں (ججوں) کی طرح دو بڑے مفتی بھی ہیں۔ ان میں سے ایک حنفی ہے جس کو شیخ الاسلام کا خطاب ملا ہوا ہے اور دونوں میں اس کا پہلا درجہ ہے اور معنوی طور پر تمام مفتیانِ ملک کا وہ سربراہ اور رئیس ہے۔ دوسرا مفتی مالکی ہے اور اس کا دوسرا درجہ ہے۔ لیکن اب کچھ دنوں سے اس کو بھی شیخ الاسلام کا لقب مل گیا ہے۔

اگرچہ پورے ملک (تونس) میں مذہب حنفی کے مقلدین کی تعداد بہت کم ہے لیکن قدیم دستور کے مطابق وہاں کی مشہور جامع الزیتونیہ

---

[31] معلوم ہوتا ہے کہ یورپی ماخذوں میں سے مصنف نے زیادہ تر فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینیوں کی اس کتاب سے مدد لی ہے۔ LOUIS MASSIGNON، ANNUAIRE du MONDE MUSULMAN. PARIS, 1923، 1929 (معراج محمد)

کے اساتذہ کی نصف تعداد احناف میں سے ہوتی ہے اور نصف مالکیوں میں سے۔ دراصل تونس میں احناف کو یہ امتیاز صرف اس لئے حاصل ہے کہ وہ شاہی خاندان کا مذہب ہے۔[32]

آج کل مصر میں شافعی اور مالکی مذہب غالب ہے، شافعی ریف (شمالی مصر) میں، اور مالکی صعید (جنوبی مصر) اور سوڈان میں۔ ان کے بعد حنفی بھی بڑی تعداد میں ہیں، اور حکومت کا یہی مذہب ہے اور اسی کے مطابق (سرکاری طور پر) فتوے دیئے جاتے ہیں اور عدالتوں میں مقدمے فیصل کئے جاتے ہیں۔ باقی رہے حنابلہ تو وہاں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے بلکہ وہ شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔

ملک شام میں حنفی مذہب کو غلبہ حاصل ہے، کیونکہ وہاں سُنیوں میں سے نصف احناف ہیں، اور ایک چوتھائی شوافع ہیں، اور ایک چوتھائی حنابلہ ہیں۔

فلسطین میں شوافع اکثریت میں ہیں، اس کے بعد حنبلی، پھر حنفی اور پھر مالکی۔

عراق میں احناف کی اکثریت ہے۔ اس کے بعد شافعی ہیں، پھر مالکی اور سب سے کم حنبلی۔

عثمانی ترکوں کی بھاری اکثریت حنفی المذہب ہے، اسی طرح البانی

---

[32] واضح رہے کہ ۱۹۵۷ء میں تونس کے شاہی خاندان کی حکومت ختم کردی گئی اور اس کی جگہ جمہوریہ قائم ہو گئی۔ ظاہر ہے اس سیاسی انقلاب کے اثرات ان عدالتی انتظامات پر پڑے ہوں گے اور موجودہ دور میں صورتِ حال تبدیل ہوئی ہوگی۔ (معراج محمد)

اور باشندگانِ بلقان اکثر حنفی ہیں۔

کُردوں کی اکثریت شافعی ہے[۵۵] یہی حال آرمینیہ کے مسلمانوں کا ہے کیونکہ وہ نسلی اعتبار سے ترکمانی ہیں یا کُردی ہیں۔

ایران کے سنیوں کی اکثریت شافعی مذہب کی پیرو ہے۔ اور باقی جو تھوڑے بچ جاتے ہیں وہ حنفی المذہب ہیں[۵۶]۔

افغانستان میں اکثریت احناف کی ہے۔ شافعی اور حنبلی بہت ہی کم ہیں۔

مغربی ترکستان[۵۷] جس میں بخارا اور خیوہ وغیرہ ہیں وہاں کے باشندے حنفی ہیں۔ اور مشرقی ترکستان جس کو چینی ترکستان بھی کہتے ہیں وہاں کی اکثریت پہلے شافعی تھی، لیکن پھر بخارا سے آنے والے علماء کی کوششوں سے وہاں بھی احناف کی اکثریت ہو گئی۔

بلادِ قوقاز[۵۸] اور اس کے گرد و نواح میں اکثر مسلمان حنفی ہیں، اگرچہ

---

۵۵ کُردوں کی آبادی پہاڑی علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے جو کردستان کہلاتا ہے اور یہ سیاسی اعتبار سے کئی ملکوں میں بٹا ہوا ہے یعنی ترکی، عراق، ایران، آرمینیا و آذربیجان میں (مترجم)

۵۶ ایران میں سنیوں کی اکثریت جنوب میں ایرانی بلوچستان میں ہے اور شمال میں اس کے صوبہ آذربیجان اور کردستان میں ہے جو ترکی سے متصل ہے۔ (معراج محمد)

۵۷ مغربی ترکستان سے ایک وسیع علاقہ مراد ہے جس میں قازقستان، ترکمانستان، ازبکستان، تاجکستان وغیرہ شامل ہیں (مترجم)

۵۸ بلادِ قوقاز یا قفقاز سے مراد کاکیشیا ہے جو بحرِ اسود اور بحیرۂ کیسپین کے درمیانی علاقہ پر مشتمل ہے، داغستان بھی یہیں واقع ہے۔ (مترجم)

شافعی بھی آباد ہیں۔

برصغیر ہند میں احناف کی اکثریت ہے، اور وہاں ان کی تعداد تقریباً چار کروڑ اسّی لاکھ ہے[۵۹]۔ وہاں شوافع بھی تقریباً دس لاکھ کی تعداد میں ہوں گے۔ اہلِ حدیث بھی یہاں کثرت سے ہیں۔ بعض دیگر مذاہب (اثنا عشریہ وغیرہ) کے متبعین بھی یہاں پائے جاتے ہیں جو ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔

جزیرۂ سیلون (سری لنکا)، فلپائن، ملائیشیا، جاوہ اور اس کے قرب و جوار کے دوسرے جزیروں (انڈونیشیا) کے باشندے

---

۵۹ یہ اعداد و شمار، ظاہر ہے کہ ۱۹۳۵ء یا اس سے قبل کے ہیں جبکہ برصغیر ہند (بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش) کی کل آبادی تقریباً چالیس کروڑ یا اس سے کچھ کم تھی۔ لیکن اب ۱۹۹۴ء میں اس برصغیر کی کل آبادی تقریباً ایک ارب ½۱۴ کروڑ ہے۔ اس میں سے صرف بھارت کی آبادی تقریباً ½۹۰ کروڑ ہے اور اس کا آٹھواں حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یعنی وہاں تقریباً ½۱۱ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ (ان میں حنفی مسلمان تقریباً ۱۰ کروڑ ہوں گے)۔

اب ۱۹۹۴ء میں پاکستان کی آبادی تقریباً ½۱۲ کروڑ ہے، اور بنگلہ دیش کی آبادی بھی تقریباً اتنی ہی ہے۔ گویا ان دونوں ملکوں کی کل آبادی ۲۵ کروڑ ہے، اور ان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ہے جن میں حنفی مسلک کے مسلمان تقریباً ½۲۱ کروڑ ہیں۔ اس حساب سے پورے برصغیر ہند میں آج کل احناف کی تعداد ۱۰ + ½۲۱ = ½۳۱ کروڑ کے قریب ہے۔

رُوئے زمین پر آج کل تقریباً ایک ارب تیس کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اور ماہرین کے اندازہ کے مطابق حنفی مذہب کے پیرو تمام مسلمانوں کا دو تہائی ہیں۔ اس لحاظ سے آج کل پوری دنیا میں حنفی مسلمانوں کی تعداد تقریباً ½۸۶ کروڑ ہے۔ (معراج محمد)

شافعی المذہب ہیں۔ اسی طرح سیام (تھائی لینڈ) کے مسلمان بھی شافعی ہیں، لیکن تھوڑی تعداد میں حنفی بھی ہیں جو ہندوستان سے آکر یہاں آبسے ہیں۔

ہند چینی (یعنی ویت نام، لاؤوس اور کمبوڈیا) اور آسٹریلیا کے مسلمان بھی شافعی المذہب ہیں۔

جنوبی امریکہ کے ملک برازیل میں تقریباً پچیس ہزار حنفی مسلمان آباد ہیں۔ جبکہ امریکہ کے دیگر ممالک اور ریاستوں میں آباد مسلمان مختلف فقہی مذاہب کے مقلد ہیں۔ اور ان کی مجموعی تعداد تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار ہے۔

حجاز میں شافعی اور حنبلی غالب اکثریت میں ہیں لیکن وہاں کے شہروں میں حنفی اور مالکی بھی پائے جاتے ہیں۔ نجد کے باشندے سب حنابلہ ہیں، اور اہلِ عسیر[10] شوافع ہیں۔ یمن، عدن اور حضرموت کے سُنّی لوگ شوافع ہیں، البتہ عدن کے گرد و نواح میں حنفی بھی پائے جاتے ہیں۔

عمان میں مذہب اباضیہ کا غلبہ ہے (بلکہ وہاں انہی کی حکومت ہے)، البتہ وہاں حنابلہ اور شوافع بھی ملتے ہیں۔ اور قطر اور بحرین میں مالکیوں کی اکثریت ہے اور جو لوگ حنابلہ ہیں وہ نجد سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں۔

احساء[11] کے اہلِ سنت کی اکثریت حنبلی اور مالکی مذہب کی پیرو ہے۔ اور کویت میں مالکیوں کی اکثریت ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[10] عسیر سعودی عرب میں حجاز اور یمن کے مابین ساحلی اور پہاڑی علاقہ کا نام ہے۔ گویا مکہ اور طائف اس کے شمال میں واقع ہیں اور نجران اس کے جنوب میں۔ (مترجم)

[11] احساء سعودی عرب کے مشرقی ساحلی علاقہ کا نام ہے جو کویت اور قطر کے درمیان واقع ہے۔ اسی کو قدیم زمانہ میں "ہجر" اور "بحرین" کہا جاتا تھا۔ (مترجم)

کتابیات

مصادر و مآخذ

ابن خلکان: وفیات الاعیان۔ (طبع بولاق ۱۲۷۵ تا ۱۲۹۹ھ)۔ (القاہرہ، المطبع المیمنیہ ۱۳۱۰ھ)۔

ابن مفلح: کناش ابن مفلح (ابن مفلح کی قلمی بیاض)۔ مخطوطہ۔

احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم: ابو عبداللہ محمد بن احمد البشاری المقدسی۔ (لیدن ۱۹۰۶ء)۔ (جدید ایڈیشن بہ تحقیق ڈاکٹر محمد مخزوم۔ بیروت ۱۹۸۷ء)

الاعلان بالتوبیخ لمن ذم علم التاریخ: شمس الدین السخاوی۔ (دمشق، مطبع الترقی القدسی ۱۹۳۰ء)۔

بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس: ابن عمیرہ الضبی القرطبی۔ (میڈرڈ، المکتبۃ الاندلسیہ، ۹۲-۱۸۸۴ء)

تحفۃ الاحباب وبغیۃ الطلاب فی الخطط والمزارات الخ: شمس الدین السخاوی، بہامش: نفح الطیب للمقری۔ (مصر ۴-۱۳۰۲ھ)

تہذیب التہذیب: ابن حجر العسقلانی۔ (حیدرآباد، دکن ۱۳۲۵ھ)۔

الثغر البسام فی ذکر من ولی قضاء الشام: ابن طولون۔ (دمشق ۱۹۵۶ء)۔

حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر والقاہرۃ: جلال الدین السیوطی۔ (القاہرہ، ادارۃ الوطن ۱۲۹۹ھ)۔ (القاہرہ، مطبعۃ الموسوعات ۱۳۲۱ھ)۔ (القاہرہ، مطبعۃ السعادۃ ۱۳۲۴ھ)۔

حلبۃ الکمیت: شمس الدین محمد النواجی۔ (بولاق ۱۲۷۶ھ)۔ (القاہرہ، مطبع الوطن ۱۲۹۹ھ)۔

خطط المقریزی = المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار المعروف بالخطط المقریزیہ: تقی الدین المقریزی (طبع بولاق ۱۲۷۰ھ)۔

الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب: ابن فرحون الیعمری۔ وبہامشہ "نیل الابتہاج" لاحمد بابا التنبکتی۔ (القاہرۃ۔ مطبعۃ السعادۃ ۱۳۲۹-۳۰ھ)

رحلۃ ابن بطوطۃ = تحفۃ النظار فی غرائب الامصار وعجائب الاسفار: ابن بطوطہ۔ (پیرس ۱۸۵۳ء) ۲ جلد۔ (القاہرہ، مطبع وادی النیل ۱۲۸۸ھ)۔ (القاہرہ مطبعۃ الخیریہ ۱۳۲۲ھ)

رفع الاصر عن قضاۃ مصر: ابن حجر العسقلانی (قلمی نسخہ)۔
[القاہرۃ، طبعۃ الامیریہ ۱۹۵۷ء]

ریحانۃ الالباء وزہرۃ الحیاۃ الدنیا: شہاب الدین احمد خفاجی۔ (بولاق ۱۲۷۳ھ)۔ (مصر ۱۲۹۴ھ)۔ (مطبع عثمان ۱۳۰۶ھ)۔
(جدید ایڈیشن: القاہرہ ۱۹۶۷ء ۲ جلد)

السحب الوابلۃ علی ضرائح الحنابلۃ: محمد بن حمید المکی (مخطوطہ؟)

سرح العیون شرح رسالۃ ابن زیدون: ابن نباتہ المصری۔ (بولاق ۱۲۷۸ھ)۔ (مصر، مطبعۃ الموسوعات ۱۳۲۱ھ) (اسکندریہ ۱۲۹۰ھ)۔

صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء: احمد القلقشندی۔ (بولاق ۱۹۰۵ء)
(قاہرہ، دار الکتب المصریہ ۲۰-۱۹۱۳ء)

صفوۃ الاعتبار بمستودع الامصار والاقطار: الشیخ محمد بیرم الخامس التونسی۔
(قاہرہ، مطبع جریدۃ الاعلام ومطبع المقتطف ۱۳۰۲-۱۱ھ)۔

الضوء اللامع لاہل القرن التاسع: شمس الدین السخاوی۔ (مخطوطہ)۔
(طبع بالقاہرۃ مطبع السعادۃ ۱۳۵۳ھ)۔

طبقات السبکی = طبقات الشافعیۃ الکبریٰ: تاج الدین السبکی۔ (القاہرۃ المطبعۃ الحسینیۃ ۱۳۲۴ھ)۔

العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین: تقی الدین محمد بن احمد الحسنی الفاسی۔
(مخطوطۃ الخزانۃ التیموریۃ بدار الکتب المصریۃ۔ رقم ۸۴۹)
۲ جلد (طبع بالقاہرۃ ۱۹۵۸ء)۔

الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ: محمد عبدالحی اللکنوی۔ (القاہرۃ، مطبع السعادۃ ۱۳۲۴ھ)۔ (جدید ایڈیشن: کراچی، قدیمی کتب خانہ، ۱۹۸۶ء)۔

قضاۃ مصر: علی بن عبدالقادر الطوخی۔ (مخطوطہ)۔

الکامل فی التاریخ: ابن الاثیر الجزری۔ (لیدن ۷۱-۱۸۵۱ء)۔
(بولاق ۱۲۷۴ھ)

محاضرۃ الاوائل ومسامرۃ الاواخر: علی دده السکتواری البوسنوی۔
(بولاق ۱۳۰۰ھ)۔ (القاہرۃ، المطبعۃ الشرقیۃ ۱۳۱۱ھ)۔

المرقاۃ الوفیۃ فی طبقات الحنفیۃ: مجد الدین الفیروزآبادی۔ (مخطوطہ)۔

معالم الایمان فی معرفۃ اہل القیروان: الشیخ ابو زید عبدالرحمن الدباغ۔
(تونس، المطبعۃ العربیۃ التونسیۃ ۱۳۲۰ھ)۔

المعجب فی تلخیص اخبار المغرب: عبدالواحد المراکشی۔ (القاہرۃ،

مطبع السعادۃ ۱۳۲۴ھ)۔ (القاہرۃ، مطبع الجمالیۃ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۱ء)
معجم البلدان: یاقوت الحموی الرومی۔ (لیپزیگ ۷۳-۱۸۶۶ء/
مصر ۲۴-۱۳۲۳ھ)۔ (طبع جدید: بیروت
۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء)
معید النعم ومبید النقم: تاج الدین السبکی۔ (لیدن ۱۹۰۸ء)
مقدمۃ ابن خلدون۔ (بیروت، مطبعۃ ادبیۃ ۱۹۰۰ء)۔
(القاہرۃ، مطبع مصطفےٰ محمد ۱۹۰۰ء)
المنہل الصافی والمستوفی بعد الوافی: ابن تغری بردی۔ (مخطوطہ)
(طبع بالقاہرۃ، دار الکتب المصریۃ ۱۳۷۵ھ)۔
مواسم الادب وآثار العجم والعرب: جعفر بن محمد الشہیر بالبیتی باعلوی
الشافی۔ (القاہرۃ، مطبعۃ السعادۃ ۱۳۲۶ھ)۔
نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب: احمد المقری۔ (بولاق ۱۲۷۹ھ)
(القاہرۃ، مطبعۃ الازہریۃ ۱۳۰۲ھ)۔
نیل الابتہاج بتطریز الدیباج [وہو ذیل لکتاب "الدیباج المذہب"]
احمد بابا التنبکتی۔ (طبع فاس ۱۳۱۷ھ)۔
وبہامش "الدیباج المذہب" (القاہرۃ، ۳۰-۱۳۲۹ھ)۔
وفیات الاعیان: ابن خلکان۔ (بولاق ۱۲۷۵ تا ۱۲۹۹ھ)۔
(القاہرۃ، المطبعۃ المیمنۃ ۱۳۱۰ھ)۔

ناشر
قدیمی کتب خانہ۔ مقابل آرام باغ۔ کراچی ۱